

سفید جھوٹ

ندا حسین

ناولس کی دنیا
Novels Ki Duniya

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔۔۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَحِبَابُ۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا" کے ناولز میں خوش آمدید۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا" ویب سائٹ / گروپ / پیج دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں۔۔۔ ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے۔۔۔۔۔

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔۔۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپ کی تحریر پوسٹ ہو جائے گی۔۔۔۔۔

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔۔۔

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

Facebook page :- [Novels ki duniya](https://www.facebook.com/Novels_ki_duniya)

(user name [@zoyatalib77](https://www.facebook.com/@zoyatalib77))

Facebook group :- [Novels ki duniya](https://www.facebook.com/Novels_ki_duniya)

Instagram Page:- [Zoya Talib](https://www.instagram.com/Zoya_Talib) (UserName: [Novelskiduniya77](https://www.instagram.com/Novelskiduniya77))

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے

["novels ki duniya"](https://www.facebook.com/Novels_ki_duniya)

اور

["website"](https://www.facebook.com/Novels_ki_duniya)

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں۔۔۔۔۔

شکریہ۔۔۔۔۔

سفید جھوٹ

از قلم: ندا حسین

باب پنجم: ”سوانح“

”حصہ دوم“

قسط نمبر: 8

ایک سوانح کو، اس کی لمبائی سے نہ جانچو

نہ اس کے اندر کے صفحات سے

حبا نچو اے، اس کے اندر کے الفاظ سے

کبھی کبھی جو ادھورے رہ جاتے ہیں،

وہی سب سے پر سوز ہوتے ہیں۔

ایک گیت کو، اس کی لمبائی سے نہ حبا نچو

نہ اس کی لے اور بحر سے

حبا نچو اے، اس کی دل کو چھوتی تال سے

روح کو سکون بخشتے الفاظ سے

کبھی کبھی جو ادھورے رہ جاتے ہیں،

وہی سب سے خوبصورت ہوتے ہیں۔

اور جب ایک شے،

تمہاری زندگی میں نور بھر دے

اور جب اس کا اثر تمہارے دلوں میں بس جائے

تو کیا وہ ادھوری ہے؟

یا لامتناہی۔

(نامعلوم)

”میں یہ نہیں کر سکتا۔“ مومن نے اپنے بالوں میں ہاتھ گزارتے پریشانی سے کہا، فون کان اور کندھے کے بیچ اٹکا رکھا تھا، آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اس نے سنک کی ٹونٹی کھول رکھی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ میں بڑی نزاکت سے اپنے پینٹ برش کا ایک ایک تنکا دھو کر صاف کر رہا تھا جیسے وہ اس کی سب سے عزیز ملکیت ہو۔

”میڈم، آپ سمجھ نہیں رہیں۔ میں نے بار امتحان دیا تک نہیں ہے اور میں اب واپس آ کر ایک سیمینار اٹینڈ ہی نہیں بلکہ ہوسٹ کروں۔۔۔“ اس نے ایک پلاسٹک بیگ میں برشز نرمی سے رکھے، اپنی کیفیت کے باوجود احتیاط برتتے ہوئے۔ ”آپ کو پتہ ہے نا مجھے بولنا نہیں پسند؟“

فون میں شاید کوئی چیخا تھا، کچھ ’اور تم نے ایک وکیل بننا ہے!‘ کے لگ بھگ جس کے باعث مومن ہلکا سا اچھل کر کچن کے درمیان بنے آئی لینڈ سے جا ٹکرایا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ اس نے آنکھیں بند کر دیں۔ ایک اور دن ضائع۔ اس کے پاس بچے ہی کتنے تھے؟ آج فروری کا کونسا دن تھا؟ اسے معلوم کیوں نہیں تھا؟! ”حمزہ وہاں شکل بھی نہ دکھائے لیکن ارتضیٰ کا آنا ضروری ہے، وہ مجھ سے بہتر۔۔۔“

”اسے بولنا نہیں پسند۔ تم خود آؤ، کافی ہے۔“ میڈم امبر نے بے نیازی سے کہا۔

”تو وہ مجھے بھی تو نہیں۔۔۔“ مومن نے گہرا سانس لیا۔ ”یس میڈم، ہو جائے گا۔ خدا۔۔۔“

کال کٹ گئی تو اس نے بیچارگی سے ”حافظ“ کہتے فون پیچھے ایک گلدان میں کھسکا دیا۔ اس نے سنگ مرمر پہ پڑے اپنے فولڈرز میں سے کاغذ نکالے اور ایک ایک کر کے انہیں سبجیکٹ کے لحاظ سے ترتیب دینے لگا۔ اس کام میں اس نے تین سو سال صرف کرنے تھے پھر ہی اپنے امتحان کی تیاری کرنے کے قابل ہونا تھا۔۔۔ اور آخر کیوں اس نے اپنے لیے لاء چنا تھا، وہ تو قانون کا پاسدار بھی نہیں تھا!

ایسے میں کچن آئی لینڈ کے سیاہ مرمر پر اس لڑکی کا عکس واضح ہوا جس کا یہاں آنا کسی طور خوش آئند نہیں تھا۔

وہ یہاں کس کام سے آئی تھی، چکراتے سر کے ساتھ سوچنا محال تھا۔ کچھ دن پہلے اس کا سر درد لوٹ آیا تھا اور اس نے چاہتے نہ چاہتے ڈاکٹر معیز کی ہدایات کے مطابق اپنی دوائیں لینی شروع کر دی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں لیکن وہ برے خواب بھی لوٹ آئے تھے۔

معمہ تھا یہ، ایک انچاھا منحصر۔

سیاہ راتوں میں دکھائی دیتے بے حد سفید خواب۔

اس نے مومن کو اپنی مقابل سمت مصروف پاتے بار سٹول پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ سیٹ کیا اور جلد ٹیپ ٹیپ کرنے لگی۔ ایکسل کی سپریڈ شیٹس، اس کی جان پر عذاب۔ اسے ابرار منزل واپس آئے دو گھنٹے ہوئے ہوں گے اور کام اتنا زیادہ تھا کہ۔۔۔ اُف۔ کچھ دیر تک اس نے تنگ ہونے لگنا تھا پھر بولنے لگ جانا تھا اور پھر مومن کو پکانا تھا۔ اور پھر اس نے کوئی جواب دینا تھا یا کوئی پرانی بات یاد دلانی تھی مگر ایمان کو سیاق و سباق معلوم ہی نہیں ہونا تھا اور۔۔۔

اس کی بورڈ پر چلتی انگلیاں تھم گئیں۔

سامنے ایک چھوٹے گلدان میں پڑے ٹیولپس کے بیج ایک آئی فون تھا۔

شکی شوہروں سے تشبیہ تو اسے ہر کوئی دیتا تھا۔۔۔

اس نے چپکے سے وہ فون اٹھایا، سکرین کو غور سے تکتے آن کیا، کوئی پاس ورڈ نہ مانگے جانے پر اس نے

یہاں وہاں ایپس کھولنے شروع کر دیے۔

نمبر ایک، گیلری۔

سکرین شاٹ پر سکرین شاٹ اور وہ بھی پڑھا کو، تاریخی یا تکنیکی باتوں کے جنہیں مومن نے کبھی سوچا

ہوگا دوبارہ پڑھنے کے لیے محفوظ کر لے لیکن دوبارہ کبھی کھولا نہیں ہوگا۔ اس نے کئی تصاویر مہنگے

پینٹس اور برشز اور پیلیٹ نائف کی رکھی تھیں، شاید کبھی خریدنے کی خواہش ہو۔ اس کی اپنی

تصاویر گنتی کی تھیں، خاندان میں سے بھی کسی کی نہیں تھی۔

سوائے ایک کے۔

مروارید ابرار کا ایک سائڈ پوز جس میں وہ ایک کینوس کے سامنے کھڑی انہماک سے برش کو پینٹ میں ڈبو رہی تھی۔ چمکدار سرمئی اور گہرے نیلے رنگ کے امتزاج کی پینٹنگ۔

ایمان کی آنکھیں غور سے سکڑ گئیں۔

یہ وہی بند سفید نیلوفر والی تصویر تھی۔ وہ گھائل عورت، زخمی فاختہ، پر سکون نیلوفر۔

مروارید پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ دکھتی تھی۔

تو یہ تھی وہ جس نے بنائی تھی وہ تصویر۔

تباہی ایک دلچسپ عمل ہے۔

اس کے علاوہ کئی تصاویر مومن کے سوتے ہوئے کی تھیں اور عجیب و غریب زاویوں سے لی گئیں اور کچھ ویڈیوز جو حمزہ نے بنا رکھی تھیں۔ کچھ خاص نہ ملنے پر ایمان آگے بڑھ گئی۔

ایک نوٹ پیڈ جہاں ڈھیروں گوگل سے کاپی پیسٹ کی گئی بالکل ریڈم چیزیں تھیں۔ جو کسی گانے کی لے، بحر اور تال بدلنے کے لیے ایپس کی لسٹ سے لے کر دوست کو زہر دے کر مارنے کے جیل فری طریقے تک محدود نہیں تھیں۔ مومن کے پاس انسٹاگرام نہیں تھا لیکن ٹوئٹر تھا، فیس بک بھی نہیں تھا

اور اس کے پاس حد سے زائد ای میلز آئی ہوئی تھیں جو زیادہ تر کام سے متعلق تھیں اور تب ایمان کو یاد آیا وہ کے ڈی میں اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر تھا۔

کیوں؟

بھنوؤں کے درمیان ایک لکیر لیے وہ ایک ڈرائنگ ایپ کو کھول کر دیکھنے لگی جہاں مومن نے کافی سارے ڈوڈلز بنا رکھے تھے۔ کچھ خاص نہیں، کچھ خوبصورت نہیں، گول مول لکیریں تھیں جیسے دیوانے پن کا دورہ ہو مگر کچھ بھی ان پینٹنگز جیسا نہیں تھا جو اس کے کسی بھی سٹوڈیو میں ٹنگی ہوں۔ اس نے واٹس ایپ کھولا۔

ایک طرف ایمان تھی جو امیر امراء میں سے ہونے کے باوجود ایک اینڈرائیڈ استعمال کرتی تھی اور ایک طرف مومن تھا، غریب غرباء میں سے جس کے پاس آئی او ایس تھا۔ وہ واٹس ایپ کے تمام کانٹیکٹ ان کے پورے ناموں کے ساتھ محفوظ رکھتا تھا جیسے ممکن تھا یادداشت چلی جائے تو بعد میں وہ فون کھول کر ان کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات تو جانتا ہو۔

ایسا ایمان کو کرنا چاہیے تھا لیکن وہ اپنی چیٹس ہمیشہ ڈیلیٹ کر دیا کرتی تھی۔

ایک غلطی۔ اب نہیں دہرائی تھی۔

مومن نے اس کا نمبر اس کے پورے نام سے محفوظ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اس نے محفوظ کیا ہی نہیں تھا۔

اس نے ایمان کو بلاک لسٹ میں سنبھال رکھا تھا۔

اس کی کنپٹی کی ایک رگ نمایاں ہوئی، اسے فوری تپ چڑھی تھی۔ اس نے واٹس ایپ ہٹانا چاہا لیکن اسے یہ آئی او ایس کچھ خاص استعمال نہیں کرنا آتا تھا۔ وہ سکرین ہٹانا چاہتی تھی، ہٹ ہی نہیں رہا تھی۔ دوسرے ایپ تو آرام سے ہٹ گئے تھے، اب کیا مسئلہ تھا۔ اس سے پہلے کہ سیری کھل کر کچھ اول فول پوچھنے لگ جاتی وہ واپس اپنے کام میں مصروف ہو جانا چاہتی تھی مگر یہ خبیث۔۔۔

”اُف!“

”بائیں کونے پر انگلی رکھو۔ نیچے کی طرف۔“ بے فکری سے جاری کی گئی ہدایت۔ ”اوں ہوں، ایسے نہیں۔ یوں۔۔۔ اب اوپر لے جاؤ۔ سب ایپس ایک ساتھ نہیں ہٹ جائیں گے مگر ایک دو تین۔۔۔ دیکھا، آسان تھا نا؟“ کئی ماہ بعد ایمان کو وہ موسیقاروں جیسی مطمئن آواز سنائی دی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا، پھر فون آف کر کے مومن کو لوٹا دیا جو ہاتھ ٹشو پیپر سے صاف کرتے اس کے پاس ہی آئی لینڈ کے ساتھ کھڑا تھا۔

”یہ ایک انتہائی ٹاکسک فون ہے، چند ایپس ہٹانا اتنا مشکل کیوں ہے؟“ ذرا بھی شرمساری لیے بنا مشورہ۔

”بنانے والے سے پوچھو۔“ مومن نے اپنا آئی فون تیرہ بنا دوسری نظر ضائع کیے جیب میں دھرا۔ وہ ایمان کو محفوظ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ کوفت زدہ تھی۔

”تم نے مجھے بلاک کر رکھا ہے؟“ وہ کہہ نہیں سکی۔ وہ کہہ کیوں نہیں سکی؟

وہ اسے گھورے جا رہی تھی، اپنے کی بورڈ پر زور و شور سے ٹک ٹک کر رہی تھی، اسے یہ یاد ہی نہیں تھا وہ کچن کا خوشی میں لیپ ٹاپ اٹھائے آگئی تھی۔ وجہ وہ شدید غصہ تھا جو اس بلاک والی حرکت نے اس میں اکسایا تھا۔

”تم مجھے میڈم امبر کی بہت یاد دلاتی ہو کبھی کبھی۔۔۔“ مومن کھاتے ہوئے بے خود سا بولا تھا۔ ”تمہارا غصہ، اصل میں۔“

ایمان نے بس اس پر ایک ترش نظر ڈالی، پھر جھولتی پونی ٹیل کے ساتھ دوبارہ لیپ ٹاپ سکرین کی اور مڑ گئی۔

”پوچھو گی نہیں وہ کون ہیں؟ بس دشمن کا پتہ رکھنے کے لیے ہی سہی۔“ مومن کی مسکراہٹ دلکش تھی۔

”تم خود بتانے کے لیے بے قرار ہو، میں پوچھ کر وقت کیوں ضائع کروں؟“ ایمان کسی بھی لمحے اس کے دانت توڑ سکتی تھی۔

وہ اتنا مسکراتا کیوں تھا؟

اسے اجازت کس نے دی تھی؟

”میڈم امبر ایک سینئر لائر اور میری یونیورسٹی پروفیسر رہی ہیں۔ ویسے وہ ایک سنگل مدر ہیں لیکن دیکھنے میں مس ہیویشم لگتی ہیں، جانے کیسے ان کے بچے ان سے ڈرتے نہیں۔ انہیں میں ہمیشہ سے بہت زہر لگتا تھا لیکن میں ایک اچھا سٹوڈنٹ رہا ہوں سو آج تک میرے جن چند بچ میٹس میں انہوں نے

کسی کی طرف تعریفی نگاہ ڈالی ہے، ان میں سے ایک میں ہوں۔ لیکن زیادہ تر تادیبی نگاہیں ہوتی ہیں، اور ایک بار۔۔۔“

وہ جانے کیوں بس کہنے لگ گیا تھا اور ایمان کے پاس جیسے سننے کو بڑا وقت تھا، وہ سننے لگی۔ اسے اپنی جان پر عذاب ایکسل شیٹس بھول گئی تھیں اور عون کے منتیں کر کے بار بار یاد دلانے والی آن لائن میٹنگز بھی۔ اس وقت وہ صرف اس لڑکے کو سن رہی تھی جو زبان سے جھوٹ بہت بولتا تھا لیکن جس کی مسکراہٹ اور آنکھیں ہمیشہ سچ کہتی تھیں۔

”ایک دفعہ ہمارا کوئی امتحان تھا اور ممتحن بھی کوئی اور نہیں، میڈم امبر تھیں۔ میرے دوست حمزہ کو تو جانتی ہوگی تم؟“ ایمان کے سر اثبات میں ہلانے پر اس نے سلسلہ جوڑا۔ ”حمزہ لیٹ تھا اور میڈم کو فون کر چکا تھا کہ اس کا ٹائر فلیٹ ہے، آنے میں وقت لگے گا۔ انہوں نے اس کا یقین نہیں کیا، کیوں کرتیں؟ وہ دیر سے آنے جانے کا شوقین تھا، اس کے چاچو شہر یا ملک سے باہر ہوتے تو ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر پر ان ڈور تھئیٹر کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر صرف میرے ساتھ۔ وہ دکھنے میں بڑا ایکسٹروورٹ ہے مگر صرف میرا دوست ہے۔“

”پوزیسو۔“ ایمان نے ہلکا سا کہتے لڈ نیچے گرائی اور سپریڈ شیٹ پر لعنت بھیجی۔

مومن نے لب کاٹتے فرش پر اپنے جوتوں کو رگڑا، مدھم مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔

”وہ پاگل ہے، اس کے پاس خود کو برداشت کرنے والوں میں میرے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں۔“

”اتنا پاگل بھی نہیں ہے۔“ ایمان بڑبڑائی اور مومن کو سر تا پا دیکھا۔

وہ اس کی نظروں پر ٹھٹھکا۔ ان میں کوئی سراہنے کی چاہ یا محبت نہیں تھی۔ بس ایک پرسکون اعتبار تھا کہ مومن کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کسی بھی انسان کے لیے سادہ سی تھی۔ جیسے وہ تھا ہی اتنا اچھا کہ اسے ساتھ رکھا جائے۔

اس کے دل میں کچھ بھاری سا بیٹھ گیا۔ لب کھولے کہ کچھ کہے، پھر رک کر سانس لیا۔ آنکھیں بند کیں۔ ایک اور سانس۔ انہیں کھولنے کے بعد وہ پہلے کی طرح پر جوش ہو گیا تھا۔

”میڈم نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو وہ ثبوت پیش کرے۔ حالانکہ کر لینا چاہیے تھا، میرے بغیر حمزہ کیوں کلاس بنک کرے گا۔ یا امتحان۔ مگر وہ ویسے ہی پراسیکیوٹر ثبوت علی آغا کے نام سے ہر کورٹ میں مشہور ہیں، یہ پھر ہماری یونیورسٹی کا لاء ڈیپارٹمنٹ تھا۔“

”اور تمہارے دوست نے اپنی بے گناہی کا ثبوت کیسے پیش کیا؟“ ایمان نے پھلوں کی ٹوکری سے مالٹا نکالا اور ساتھ ایک چھری۔ وہ مسکان دبائے اسے محویت سے دیکھ رہی تھی۔

مومن باقاعدہ ہنس رہا تھا۔

”میں نے میڈم کو کبھی اتنا لاجواب اور ششدر نہیں دیکھا۔ حمزہ اگر ام ہال میں اپنا فلیٹ ٹائر اٹھا لایا، یہ الگ بات کہ اسے زندگی میں پہلی بار ایک رکشے میں سوار ہو کر آنا پڑا جو اس کی انا پر بڑا گراں گزرا ہو گا۔“

ایمان کی ہنسی بے اختیار تھی، وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی۔

جس حمزہ سے وہ ملی تھی وہ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوا تھا۔ مزاحیہ، دوستی کے معاملے میں شدت پسند، اتنا زیادہ کہ وہ مومن کو تکلیف پہنچانے والی لڑکی سے اچھے سے بات کرنے کا روادار بالکل بھی نہیں تھا۔ سحیر کے کیفے میں ان دونوں کی ملاقات میں کافی تناؤ تھا۔

لیکن کیا وہ تناؤ واقعی صرف مومن کی وجہ سے تھا؟

ان کے سکول کے دن اس بات کو تھوڑا واضح کر دیں گے۔

دو ہزار تیرہ، ماہ ستمبر۔

یہ کہنا ایک مبالغہ نہیں ہو گا کہ سکول کے دور میں دو لوگوں کی دشمنی کیمپس کے ہر کونے میں مشہور تھی۔

مومن اور ایمان کی نہیں۔

حمزہ اور نگزیب اور ایمان جاوید کی۔

کسی بیوقوف میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے مذاق سمجھتا یا کسی رومانوی داستان کی لطیف شروعات۔ سب کو پتہ تھا وہ دونوں شہزادی مومنہ (شہزادے مومن!) کے لیے لڑ رہے تھے۔

روزانہ ایک کام ہوتا تھا۔

ویسے تو آٹھویں جماعت کا یہ سال اپریل سے شروع تھا مگر مومن اور مروارید ان دنوں اپنے اماں ابا کے کیس کی وجہ سے سکول جانا چھوڑ چکے تھے اور اماں ابا ایسے مصروف تھے کہ کبھی پوچھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ سکول اگست میں دوبارہ کھلے تھے اور اب وہ اور مروانے سکول جانے لگے تھے کیونکہ ابا ان

کی حفاظت پر کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ مومن کے ساتھ والی سیٹ پہلے دن خالی تھی۔ وہاں حمزہ نے بیٹھنا تھا۔ مگر ڈرگ مافیا (ستے جوس کی کاروباری مافیا) والی نئی طالبہ نے مومن کے ساتھ والی سیٹ پر بیگ رکھ دیا۔

اور پھر وہ روزانہ جلدی پہنچ کر یہی کیا کرتی۔

ان کی کبھی دوستی نہیں رہی تھی۔ وہ بات تک نہیں کرتے تھے، سلام یا ہیلو ہائے تو دور کی بات۔ وہ ایک دوسرے کو سٹیشنری تک نہیں دیتے تھے، بھلے دوسرا ٹیچر سے ڈانٹ کھا رہا ہو۔ اگر وہ نظریں ملاتے تھے تو صرف تب جب دوسرا ٹیچر سے بے عزت ہو رہا ہو۔

دو ڈیسک ساتھ جڑے نہیں ہوتے تھے مگر مومن دیوار کے ساتھ والی قطار میں بیٹھتا تھا، جگہ ہی وہاں ملتی تھی۔ اس کے ساتھ حمزہ نے بیٹھنا تھا جو اس کی ساتھ ہی گورنمنٹ سکول سے سیدھا یہاں آیا تھا، مگر قسمت ہی ایسی تھی، طہ اور جاوید کی دوستی میں دونوں کے بچے ایک ہی سکول میں تھے اور شدید ناخوش۔

کم از کم مومن تو ناخوش تھا۔

ہر پیر کو کلاس سپیکر میں اعلان ہوتا تھا۔

”حمزہ اور نگزیب، پرنسپل آفس۔“

کسی پیر کو وہ اعلان نہ ہو پاتا تو کوئی نہ کوئی ٹیچر بریک کے بعد حمزہ کو وہاں کان سے پکڑ کر لے جا رہی ہوتیں۔

حمزہ تھوڑا شیطان تھا مگر ہر بار اس کی غلطی نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار تو اسے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سزا دی گئی اور نا انصاف منصفوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔

سر رافع کا سر گنجا ہو گیا۔

”حمزہ اور نگزیب، پرنسپل آفس۔“

میڈم جمیلہ کا بلیو ڈائی لیب کوٹ۔

”حمزہ اور نگزیب، پرنسپل آفس۔“

مس منیزہ کو کسی کا لو لیٹر ملا؟ لیکن وہ تو حمزہ کو اچھی بھی نہیں لگتی تھیں۔

”حمزہ اور نگزیب، پرنسپل آفس۔“

انزلہ اور موسیٰ کی ٹین اتج، غلطی، جسے حمزہ نے ہی پکڑوایا تھا، مگر وہ بیچ میں مفت کا پھنس گیا۔

”حمزہ اور نگزیب، پرنسپل۔۔۔“

”آفس۔“ مومن اور حمزہ یکساں کہا کرتے تھے۔

مومن کو عادت ہو گئی تھی، کینیٹین کا سینڈویچ منہ میں ہوتا تھا اور کوئی نہ کوئی حمزہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوتا تھا جیسے وہ ہندوستان سے بھاگا جاسوس ہو یا کوئی ایسا سپاہی جو لاہور میں چائے پینے کا خواہشمند ہو۔

مگر حمزہ کو تو چائے بھی نہیں پسند تھی!

سپورٹس سرکنڈھا ایسے پکڑتے تھے کہ بندے کی روح آدھی سفر کر جائے، حمزہ تو ان سب ناانصافیوں سے مضبوط اور ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا وجہ کون ہے مگر شک سب کا ایک ہی انسان پہ آکر ٹھہر جاتا تھا۔

ایمان جاوید کرمانی۔

مگر وہ لڑکی اتنی چپ چاپ رہتی تھی، کہنے کو عقل تھی ہی نہیں، سارے ٹیسٹس میں فیل ہوتی تھی، اور

سچ کہا جائے تو لوگ اس سے ڈرتے تھے۔

اس کے سیاہ بال ہمیشہ ایک آنکھ کے اوپر پردے کی طرح گرے رہتے تھے اور جو آنکھ دکھائی دیتی تھی وہ دیکھنے والے کو اندر تک پڑھ لیتی تھی۔

طلبہ اس سے دور بھاگتے تھے اور سو باتیں کرتے تھے جو افواہوں کی طرح ہر راہداری میں سنائی دیتی تھیں مگر اس کے چہرے پر کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ زیادہ تر تو اچھے سے بات کرتے تھے، کہیں وہ کچھ کرنے دے۔

انہیں کیا معلوم کے اس سکول میں ایمان کے لیے صرف دو لوگ اہم تھے۔ ملائکہ اور مروارید۔ اور کسی حد تک مومن۔

لیکن وہ بھی تجسس کی وجہ سے۔

ان کی ایک ماہ پہلے کی ملاقات میں اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی کوئی کہانی ہے۔ اور بعد میں ڈیڈ سے پتہ چلا تھا کہ اس کی مام کی موت ہو چکی ہے۔

حال ہی میں۔

ایمان کی مام کی موت کے ڈیڑھ مہینے بعد۔

کس کو تجسس نہ ہو؟

اس کا سستے جوس اور چپس والا بزنس مومن کی آنکھوں کے سامنے شروع ہوا تھا۔

اس کو پکڑوایا بھی مومن نے تھا، حمزہ کے ساتھ ہر زیادتی کا بدلہ لیتے۔

ایمان نے اس سے کبھی بدلہ نہیں لیا تھا، اس کی دوست سے وفاداری کو داد دیتے۔ مگر یہ ستمبر کے بعد کے واقعات تھے۔

اکتوبر آخری ہفتے میں حمزہ نے ایمان کے خلاف ایک پوری تدبیر تیار کی تھی۔ اس بار وہ پکڑی جائے گی۔ اس بار حمزہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

اور نومبر کے ایک اتفاقہ پیر کو یہی ہوا۔

”ایمان جاوید کرمانی، پرنسپل آفس۔“

حمزہ کے چہرے سے انتقام کی خوشی ٹپک رہی تھی، مومن کے کان کھڑے تھے اور ایمان۔۔۔ وہ چپ

چاپ جس انداز میں کلاس میں داخل ہوتی تھی، اسی انداز میں چلی گئی۔ حمزہ نے اپنے حق، اپنے دوست

کے ساتھ والی سیٹ پر فوراً جگہ جمالی۔

آج مزے ہی مزے تھے۔

ایمان راہداری میں جکڑے ہوئے جسم کے ساتھ پرنسپل آفس روانہ تھی۔ بیچ راہ میں ایک اور اعلان ہوا اور اب ملائکہ بھی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ جہاں ملائکہ اس کی پیٹھ کو گھورے جا رہی تھی، ایمان ماتھے پر شکنیں لیے ذہن میں حمزہ سے بدلے کے طریقے ترتیب دے رہی تھی۔

پرنسپل کے دروازے پر دستک دے کر وہ دونوں اندر داخل ہوئیں۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں، اپنے اگلے پچھلے گناہوں پر پشیمانی اور ماں باپ کے یہاں بلائے جانے کے خوف سے واضح نیلاہٹ۔ جاوید پرنسپل کے سامنے ڈیسک پر موجود تھا۔

ایمان کا دل بیٹھنے لگا۔ ملائکہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں نے جگہ لے لی۔

”جی، کرمانی صاحب۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ایمان کے گریڈز پر توجہ دیں۔ رپورٹ اتنی متاثر کن نہیں آ رہی۔“ پرنسپل صاحب نے اپنی لمبی مونچھوں اور داڑھی کے بالوں کو دو انگلیوں کے بیچ چھوا۔

”آپ جانتے ہیں وہ اردو کچھ خاص نہیں جانتی، جس بورڈنگ سکول سے پاکستان لوٹی ہے وہ اردو نہیں پڑھاتا تھا۔“ جاوید کی مسکراہٹ شائستہ لیکن سخت تھی۔

ایمان کسی بورڈنگ سکول سے یہاں نہیں آئی تھی مگر فینٹسی یہی تھی۔ ریلیٹی کچھ اور۔

جھماکے سے اس کے سامنے آگ میں جھلستا وہ وجود آیا اور وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کی حرکت بہت کمزور تھی مگر ملائکہ نے دیکھ لی، کچھ کہہ نہ سکی۔ ایمان اس کے ساتھ بھی خاموش رہتی تھی۔ ہولے سے اس نے اپنے ہاتھ کی جلی ہوئی جلد کو چھوا جیسے اب بھی ویسی ہی جلن اور چھن محسوس کر سکتی ہو جیسی تب۔ اتنے ماہ پہلے۔ اس صبح جب سورج اس کے گھر پر طلوع ہوا تھا۔

ایسا نہیں تھا مگر ذہن ایک طاقتور شے ہے، جو خیال اندر بٹھا دے، اسے محسوس کروا کر دم لیتا ہے۔ اس لیے ایک بات یاد رکھو۔ اپنے خیالات پر قابو پاؤ۔ ایک برا خیال تمہارا دن برباد کر سکتا ہے۔ مسلسل برے خیالات تمہارا جینا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔

یا بہتر طور پر کہا جائے، تمہارے ذہن میں۔

”ملائکہ بچے کی پرفارمنس ہمیشہ کی طرح اچھی ہے، بہتری کی گنجائش ہے۔ اس کے لیے آپ اس کی جغرافیہ کی ٹیچر سے بات کریں، ان کے پاس کہنے کو بہت ہے۔“ پرنسپل صاحب نے اپنے میز پر ایک کتاب کے صفحے پر کچھ درج کیا اور اسے پھاڑ کر جاوید کو تھما دیا۔

”یہ لیں، اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“

جاوید نے اپنی بیٹیوں کو ساتھ آنے کا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ایمان اور ملائکہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”شارٹ لیو ہے یہ، بچو! آج آپ کی ڈینٹسٹ اپوائنٹمنٹ ہے۔“ جاوید نے سنجیدگی سے یاد دلایا۔

جہاں ایمان نے سکون کا سانس کیا، ملائکہ کا فوراً منہ کھلا۔

”وہ تو جمعرات کو نہیں ہو۔۔۔“

”کینسل ہو گئی تھی اور اب ہوگی۔“ ایمان نے اسے کہنی ماری اور بازو سے پکڑ کر باہر ساتھ کے چلی۔

جاوید نے سر ہلا کر پرنسپل کو خدا حافظ کہا اور ان دونوں کے پیچھے باہر نکل آیا۔

جب وہ پارکنگ لاٹ میں پہنچے تو ایمان اور ملائکہ کی چیخ شروع تھی۔

”تم پاگل تو نہیں ہو؟ سمجھ نہیں آتا ہم کسی اور وجہ سے باہر آئے ہیں؟“ ایمان نے ملائکہ کی چوٹی

کھینچی۔

”میں بس پوچھ رہی تھی!“ ملائکہ نے اس کے ماتھے پر گرے بال ہٹائے اور اس کی آنکھوں کو روشنی میں آنے دیا۔ ایمان نے کسی روشنی سے جل جانے والے ویمپائر کی طرح ہسس کیا اور آنکھ دوبارہ چھپائی۔

جاوید ایک مدہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنی لینڈ کروزر تک پہنچا اور دونوں کو پیچھے والی سیٹس پر بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
منتہی پہلے ہی اندر موجود تھیں۔

”آپ کو اجازت مل گئی؟“ اس نے سب کے اندر آتے ہی سلام کیا، جواب سنا، پھر سیدھا یہ سوال کیا۔
”کیوں نہیں۔ قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہے۔ کون روکے گا ہمیں؟“
ایمان اور ملائکہ دو لمحوں کو ساکت رہ گئیں۔ پھر دونوں نے شور کا جو آغاز کیا تو وہ سکول سے کروزر ر باہر لے جانے تک غائب نہیں ہوا۔

”آپ دنیا کے سب سے اچھے ڈیڈ ہیں!“ ملائکہ نے خوشی سے صدا لگائی۔ ”اور آپ بھی ایک اچھی مام ہیں۔“ منتہی کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے کہا جس پر وہ ہنس دی۔

ایمان چپ سی مسکراتی رہی۔ اس نے بیک ویو آئینے سے جاوید سے نظریں ملائیں۔ ایک سی دکھنے والی سرمئی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔

ان میں ایک سمجھتا ہوا تاثر اور ڈھیروں یگانگت تھی۔

☆☆☆

”تمہارا دوست ایک ڈرامہ ہے۔“ حال میں واپس آؤ تو دیکھو، ایمان ہنس رہی تھی۔

”ایسا ویسا۔“ مومن نے مرمریں سطح پہ پڑے اپنے کاغذات اور فائلز اٹھائیں، ایک دو پرانی پھٹی کتابیں

بھی۔ ”میں منہ چھپا کر ٹیسٹ دیتا رہ سکتا تھا کیونکہ اس وقت حمزہ کا ساتھ دینا میرے لیے مشکلات کا

سبب بن سکتا تھا۔ لیکن میں دوستی کے معاملے میں تھوڑا شدت پسند واقع ہوا ہوں، میں امتحان سے کھڑا

ہو گیا اور اس کے ساتھ ہال سے باہر ڈانٹ سننے نکل گیا۔ وفاداری، ہمیشہ۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ ”شکر خدا کا

وہ فائل نہیں تھے۔ میڈم کو بدلہ لینے کے لیے ہمیشہ ہم دونوں ہی ملتے تھے اور وہ ہم غریب انٹرنز کو ہر

ساس بہو ٹائپ کیس پر ریسرچ کا کہہ دیتی تھیں جیسے دنیا نے ان تعلقات کی گہرائی سمجھ کر ہی آگے

بڑھ سکتا ہے۔“

اس کے ابرو خفگی سے بھیج گئے، آنکھوں میں یاد کرتے ہوئے معصومانہ سی تلخی ابھری۔

”ساس بہو ٹائپ کیسز کو سلجھانا اتنا ہی بیکار ہے تو وہ دیا کیوں کرتی تھیں؟“ ایمان مالٹے کی قاشیں کاٹ

کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”یو شیور، تم عورتوں کو سٹیریو ٹائپ نہیں کر رہے؟“

مومن نے ایک قاش اس کے پیالے سے نکالی اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ اس کا چہرہ حد سنجیدہ تھا۔

”شاہینہ بیگم نے اپنی بہو پر اپنے خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتی ہاتھ کی کڑھائی والی چادر کی چوری

کا الزام لگایا۔ اور وہ بہوؤں میں ہی منتقل ہوتی تھی۔“

چند سرد لمحات ایک گھمبیر خاموشی کی نظر ہو گئے۔

پھر وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

ایمان سٹول سے اتر گئی اور مالٹے کا اتارا گیا چھلکا ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

”مجھے میڈم امبر سے ملنا ہے۔“ اس نے نظروں میں ایک محظوظ چمک لیے کہا۔

”کیوں نہیں، وہ پہلی نظر میں تمہیں قاتلہ قرار دے دیں گی۔“ مومن نے اپنے برشز کو ان کے ڈبے

میں سمیٹا۔

”جیسا کہ میں نے ایک بار کہا تھا۔۔۔“ ایمان نے اپنے سویٹر کی آستین میں ہاتھ چھپا لیے۔ ”ایک قاتلہ ہونا بڑا دلچسپ ہو گا۔“

”تم سے کوئی بعید نہیں۔“ مومن نے سوچے بنا بالوں میں ہاتھ پھیرا، جن کا شیمپو اس کے پینٹ برشز کے شیمپو کے مقابلے میں واقعی بڑا سستہ تھا۔ ایک آرٹسٹ کی خصوصیات میں سے ایک، ان کے پینٹ برشز ان کے لیے اس کڑھائی والی چادر جیسے قیمتی ہوتے ہیں۔

”ایسے ہی جیسے تم سے۔ غریب، ہونہ۔“ ایمان کو پیاس لگ رہی تھی، فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔ ”کیا مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ دکھانا پڑے گا؟“ اس کے پاس کام بہت تھے لیکن وہ جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ اس کی ’سازش‘ جیسے حمزہ نے کہا تھا، اسی کا حصہ ہے۔ مگر وہ خود سے کب تک جھوٹ بولتا۔

ایمان یونہی بولتی رہتی اور مومن یونہی سنتا رہتا۔ بوریت کا وہاں کوئی کام نہ تھا۔ شکایت کا کوئی گزر نہیں۔

”تم ڈیزائنر کپڑے پہنتے ہو۔“ ایمان اس کو گنوانے لگی۔ ”تئیس کے ہو اور تمہارے پاس اپنا اپارٹمنٹ اور اپنی کار ہے۔ ساتھ یہ آئی فون۔“ ایمان نے اس فضول کی ایجاد پر ایک نگاہ غلط ڈالی۔ ”اور تمہارے پاس ایلٹ کلاس کی جم میمبر شپ ہے، ناکہ عام جمز کی۔ خود کو غریب کہہ کے غریبوں کو مت رلاؤ۔“ مومن برا منا گیا، اس نے کب خود کو غریب کہا تھا۔۔۔

”تم مجھے سٹاک وغیرہ تو نہیں کرتی؟ کیونکہ ایسی انٹینشن ٹو ڈیٹیل۔۔۔“ ایمان کی پتلیاں سکڑنے کے ساتھ ہی مومن کے لب دائیں کونے سے اوپر کو اٹھ گئے۔

”دشمن کے بارے میں جتنا معلوم ہو اتنا بہتر ہے۔“ ایمان نے تنبیہی کہا، جانے کیوں خبردار سا کر رہی تھی۔

کیونکہ مومن کے اس دن کے الفاظ۔۔۔

میں پتہ لگا لوں گا۔

اسے معلوم تھا وہ پتہ لگا لے گا۔ کونسا کسی جاسوس کی ضرورت پڑنا تھی۔

وہ جانتی تھی وہ جان لے گا اور ایمان نے اسے قتل کر دینا تھا۔

”ایک اور بات جاننا چاہو گی؟“ مومن نے اپنی جیب سے ان ہیلر نکالا۔ ”مجھے ایزما ہے۔“

وہ گھوم کر چولہے تک گیا جہاں وہ اپنی بلیک کافی سڑنے کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ وہ اتنا کوئی پھوٹ نہیں تھا لیکن اُف، کچن میں دودھ سے جو بھی کام لیا جائے، ہمیشہ کسی قیمت پر آتا تھا۔ جلتی کافی ایک مگ میں انڈلی اور اس تک واپس آیا۔

”تم مجھ سے مروت میں بھی نہیں پوچھو گے کہ میں کافی پیوں گی یا نہیں؟“ ایمان ایک سرے پر اور مومن دوسرے پر آئی لینڈ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

”تمہیں وہ پسند ہی نہیں تو پوچھوں کیوں؟“ مومن نے سادگی سے کہا۔

”اور اگر اب پسند ہوئی تو؟“ ایمان نے فرش پر ہیل کو جنبش دی۔

”تمہاری یادداشت گئی ہے، ٹیسٹ بڈز نہیں بدل گئے۔ چاہو تو پی کر دیکھ لو، ساس پین میں تھوڑی رہ گئی ہوگی۔“ اس نے سچ میں بے مروتی سے کہا اور گہرے گھونٹ بھرنے لگا۔

”تمہیں ایزما ہے مگر اس دن اس آدمی کی ٹھکانی کرتے ہوئے تو تم بالکل ٹھیک تھے۔۔۔“ ایمان نے

مشکوک انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

مومن اب واقعی خفا ہوا تھا۔

”میں زیادہ تر اکرلیک پینٹس استعمال کرتا ہوں ورنہ مجھے سانس لینے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ تم ایسے کہہ سکتی ہو کہ آرٹ وہ شوق ہے جسے میں نے سانسوں کی پرواہ کیے بنا اپنایا ہے۔ وہ میرے لیے خاص ہے۔ خیر، میں اپنے ساتھ ہمیشہ ایک ماسک اور ان ہیلر رکھتا ہوں۔ سردیوں میں کیفٹین، خاص طور سے بلیک کافی میری صحت کے لیے اچھی رہتی ہے۔ یہ میں شوقیہ نہیں پیتا لیکن اب عادت ہو گئی ہے۔“ مومن نے ابرو ترچھی کر کے اسے دیکھا، جیسے ایمان کے ’کالی روح جیسی کالی کافی‘ والے لطیفے کا جواب دیے ہو۔

”اور۔۔۔“

”وہ خوبصورت ہیں۔“

”کیا؟“ مومن دوبارہ ٹھٹھکا۔

”تمہارے اکرلیکس۔“ ایمان نے اسی سادہ اطمینان سے کہا جو مومن کو گڑبڑا رہا تھا۔ ”مجھے اپنی پینٹنگ کے بارے میں بتاؤ۔“ اس نے جیسے آرٹ کے علاوہ دوسری کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔

مومن نے لب کھولے، بند کیے۔ دوبارہ کھولے اور کافی کا گھونٹ بھرا۔ پلکیں بار بار جھپکائیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا، اس کا ٹمپر پچر بڑھ گیا تھا۔

”میں ایک obsessive ہوں۔“ کافی کی بھاپ میں اس کے لبوں نے جنبش کی۔ ”ایک سائیکو پیتھ جیسا آبیو سو نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”ایک بات بتاؤ۔ دنیا میں جب بھی کوئی تحریک چلی ہے تو سب سے اہم کردار کس نے ادا کیا؟“

”جذبات نے۔ ہر انقلاب اور ہر بیوقوفی کے پیچھے جذبات ہوتے ہیں۔“ ایمان نے سکون سے جواب دیا۔

”اگزیکٹلی۔ اور ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے ہمارا کلچر۔“ وہ ایک ہاتھ اٹھائے سمجھا رہا تھا۔ ”تاریخ میں جب بھی ہمیں کچھ چاہیے تھا، ہمارے لیڈران نے ہمارے جذبات اکسائے اور ہم نے تحریک چلائیں۔ سب سے عظیم تحریک کا مقصد آزادی، عزت اور انتقام تھا۔ ان سب میں سب سے اہم کردار کلچر نے ادا کیا کیونکہ ہمارے لوگوں کو کنٹرول کرنے والی سب سے بڑی طاقت ہمارا کلچر ہوتا ہے۔ اور یہ تین چیزوں سے بنتا ہے۔ موسیقی، ادب اور مصوری۔ یہ تینوں فن ہیں۔ اور بہترین فن کار دیوانے ہوتے ہیں۔“

ہیں۔“

سرد ہوا جم چکی تھی، ساکت اور مبہوت۔ کچن سے باہر کو جاتا جالی دار دروازہ آج بھی کئی سال پہلے جیسا دکھتا تھا مگر بند تھا اور اس کے ساتھ جڑا شیشے کا دروازہ بھی بند تھا۔ باہر ڈھلتی شام کا منظر تھا حالانکہ وقت دوپہر کا تھا۔ فروری کے اوائل کی وہ شام جیسی دوپہر سکوت برپا کیے غور سے سن رہی تھی۔

”جاپان میں بھی ایک ایسی تحریک چلی۔ پاگل مصوروں کی۔ The Obsessionals۔ وہ ایک ہی طرح کے آرٹ سٹائل میں اپنا آپ کھو چکے ہوتے تھے اور اسی کو لے کر اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے۔ وہ اپنا آرٹ بیچتے نہیں تھے، ان کے لیے یہ ایک توہین تھی۔ آف کورس اس میں کچھ غلط نہیں اور لوگوں کو اپنی محنت کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ لیکن میں ان لوگوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ ملکیت کا ایک انوکھا احساس ہوتا ہے جب تمہارا بنا تمہارے سوا کسی اور کا نہیں۔ اس پر صرف تمہارا حق ہے۔ اور اگر کسی کو دینا ہو تو تم وہ احسان یا تحفے کے طور پر دو۔ اظہارِ محبت۔“ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”ایک آرٹسٹ کسی کو اپنی بنائی گئی تصویر جب دیتا ہے تو اپنی روح کا ایک ٹکڑا دیتا ہے۔ اپنی ذات کا ایک حصہ۔ اور جب اس کی ناقدری کی جائے تو وہ مرتے دم تک تمہیں معاف نہیں کرتا۔“

ٹھنڈ میں اضافہ ہوا اور مومن اپنا مگ خالی کر کے سنک تک لے گیا۔

”کیا میں نے تمہاری کسی پینٹنگ کی ناقدری کی تھی؟“ ایمان نے سکوت میں خلل ڈالا۔

مومن ہلکا سا ہنس دیا۔ تلخ، سفاک۔

”میں نے آج تک تمہیں کوئی پینٹنگ تحفے میں نہیں دی۔“

ایمان کا چہرہ ہتک پر بجھ گیا۔ وہ جانے ہی والی تھی، اپنا سامان اٹھاتے جلدی نکلنے کو بڑھی۔ یادیں کھو

دینے کے بعد یہ پہلی دفعہ تھا جب مومن نے اس کا دل دکھایا تھا۔

مگر وہ بیچ چوٹ کے ٹھہر گئی۔

وہ کون ہوتا تھا اس کا دل دکھانے والا؟

”تم نے مجھے بلاک کیوں کر رکھا ہے؟“ وہ لیپ ٹاپ اور فون سینے سے لگائے اسے گھور رہی تھی۔

مومن مگ دھو کر ہاتھ پونچھ رہا تھا، محض سر ہلایا۔

”تم بتا کر چوری کرنے والوں میں سے ہو۔ میری پینٹنگز چرائیتی تھی اور کبھی نہیں لوٹاتی تھی۔ میں

چوروں سے رابطہ نہیں رکھتا۔“ اس نے لب سکیڑے بے خیال خفگی سے کہا۔

”اُن بلاک کرو۔“ ایمان کے کان سرخ پڑ رہے تھے۔ مومن نے تابعداری سے دوبارہ سر ہلایا۔ ”میں تمہاری باس بھی ہوں۔ اور تم ایک بیکار مینیجر جس نے دو ہفتوں سے کمپنی کی کسی ای میل کا جواب نہیں دیا۔“

مومن کے ابرو حیرت سے اٹھے۔

”تم نے پانچ منٹ میں کیا کچھ دیکھ لیا ہے؟“

”تمہارے اگلے پچھلے سارے افیئرز اور ہر لڑکی کے میسجز۔“ ایمان نے آنکھیں گھمائیں اور بال جھٹکے۔

”عون کی میل کا جواب یاد سے دینا۔“

وہ رکی نہیں اور وہاں سے چلی گئی۔

”شکی لڑکی۔“ مومن نے سر جھٹکا، مسکراہٹ بے اختیار تھی۔ ”میں جو بھی ہوں اور جیسا بھی ہوں، تم ٹھیک بالکل بھی نہیں ہو، ایمان جاوید۔“

☆☆☆

وہ گاڑی میں بیٹھی بے حد خوف زدہ تھی۔

”آخری بار آپ نے چوری کب کی تھی؟“ سولہ سالہ ایمان نے سٹیرنگ وہیل پر بیٹھے کہا۔

صبح کی سنہری کرنیں، گہرا نیلا فلک اور معمول سے زیادہ پیارے لگتے سفید روئی سے بادل۔

”میں کہہ تو رہا ہوں تمہاری مام سے پوچھ کر گاڑی لی ہے۔“ جاوید بے فکری سے پیسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”اور میں نے مان لیا۔“ ایمان نے ناز سے سر جھٹکا۔ ”اب بتائیں، شہر کے مضافات میں ہم کیا لینے آئے

ہیں؟“

دو ہزار سولہ، ماہ اپریل۔

منہتی کی نیلی کار ایک کھیت میں کھڑی تھی۔ ایک خالی کھیت جس میں ایک بڑا سا درخت دکھائی دے رہا

تھا۔ ایمان ظاہر نہیں کرتی تھی مگر اسے ابھی بھی خوف کھا رہا تھا۔ گاڑی چلانے کے خیال سے ہی اس پر

کیچی طاری ہو جاتی تھی۔

اور اس کا وہی خوف ختم کرنے کے لیے جاوید فجر کی اذانوں کے ساتھ اسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا

تھا۔ گاڑی کا رخ اتنی دور سے بھی ٹھیک اس درخت کی سمت تھا۔ چند منٹ پہلے ہی ان دونوں نے اپنی

جگہوں کا تبادلہ کیا تھا اور ایمان ابھی تک الجھن میں تھی، کیا وہ ایک کھیت میں ڈرائیونگ سیکھنے والے تھے؟

تھا تو یہ بھی ایک خالی میدان مگر بیچ میں ایک درخت تھا۔ اور ایمان صرف ڈرائیور کی سیٹ پر بڑی ہمت کر کے بیٹھی تھی، وہ یہ گاڑی نہیں چلا سکتی تھی۔ اس صدی میں تو نہیں۔

”وہ سامنے درخت دیکھ رہی ہو؟“ جاوید نے بلا ضرورت کہا۔ ظاہر تھا وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس ویرانے میں وہی تو نظر آتا تھا۔

”جی۔“ ایمان نے بند ہوتے حلق سے نکالا۔

”انگنیشن گھما کر ایکسپریٹر دباؤ۔“ حکم آیا۔

ایمان نے تھوک نگلا۔ جیسا کہا گیا ویسا کیا۔

”اب کار پوری سپیڈ کے ساتھ اس درخت میں دے مارو۔“ جاوید نے بے نیاز سنجیدگی سے کہا۔

ایمان نے کار چلا دی۔

اور بیچ راستے کہ اپنے باپ کے الفاظ اچھی طرح سمجھنے پر وہ ٹھہر گئی۔

”ڈیڈ، کیا؟“ اس نے کار پوری رفتار سے چلا دی تھی۔ وہ چاہ کر بھی ایکسپریٹر سے پاؤں نہیں ہٹا سکتی تھی، وہ پوری طرح ششدر تھی، یہ کیا ہو رہا تھا؟

”تم کار مت روکنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ جاوید نے اطمینان سے کہا۔

”ہم مر جائیں گے، ڈیڈ!“ وہ چیخی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“

”ڈیڈ!“

”Die a death worth a scandal.“

”ایک درخت میں کون کسی سکینڈل کے لیے سرمارتا ہے؟!“ ایمان ہدیانی چلائی تھی۔

اڑتے بالوں، دل کی تیز رفتار اور اپنی نظروں کے سامنے منڈلاتی موت کو دیکھتے ایمان نے اپنے ہوش و حواس کو پانے کے بعد بھی گاڑی نہیں روکی۔

مرنا تھا تو ایک ساتھ مرنا تھا، یہ تو ازل سے طے تھا۔

وہ اس موٹے تنے کے طاقتور پیڑ سے زیادہ دور نہیں تھے۔

سو میٹر۔

زندگی ختم ہونے والی تھی۔

پچاس میٹر۔

ایمان نے آنکھیں میچ رکھی تھیں، ہاتھ سٹیرنگ پر مضبوطی سے جمے تھے۔

دس میٹر۔

یہ اتنی جلدی کیسے۔۔۔

گاڑی زور سے اپنے ہدف سے جا ٹکرائی۔

چند منٹ بعد وہ دونوں دھوئیں میں ہانپتے کانپتے گاڑی سے باہر نکل رہے تھے۔ ایر بیگ وقت پر نکل آیا تھا اور وہ دونوں زندہ تھے۔ گاڑی کی حالت البتہ تشویشناک تھی۔

”کیسا لگا؟“ جاوید کی مسکراہٹ جی دار تھی۔

ایمان زور زور سے کھانس رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ ٹیالا۔ جسم

تعب سے جکڑا ہوا تھا، تنفس پھولا۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کچھ دیر جھکی رہی۔ سانس بحال کیا۔ سر اٹھایا تو مسکراہٹ جی دار تھی۔

”پھر سے کریں؟“

جاوید ہنسنے لگا، جان میں جان آئی۔

خوف ختم کرنے کا بہترین طریقہ؟

اس سے ہاتھ ملا کر دوستی کر لو، نہ خوف باقی رہتا ہے نہ اس کا زور۔

”لیکن ڈیڈ۔۔۔“ ایمان کو فوری چپ لگی۔

”ہاں، کہو۔“ جاوید دوبارہ ایسا کرنے کے لیے تیار تھا۔ گاڑی کی حالت ذرا خراب تھی، تو کیا۔ ایک بار پھر

کرنے میں کیا مضائقہ تھا؟

”یہ مام کی کار تھی۔“

جاوید نے ایک بار گاڑی کا ماڈل دیکھا، اس کا گہرا نیلا رنگ اور پھر اس کی بربادی کو۔

تھوک نگلا۔

ایمان اس کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئی، سر اثبات میں ہلایا۔ بہادر سپاہی۔

”مل کر اس مسئلے سے باہر نکلیں گے۔“

جاوید نے سر دائیں بائیں ہلایا، یکدم خوف زدہ۔

”مام کو نہیں بتائیں گے۔“

اس دن وہ دونوں گھر دیر سے پہنچے تھے۔ سارا دن گاڑی کے ڈینٹ کو نظر انداز کرتے وہ قصور میں گھومتے پھرتے رہے۔ منتہی سے سامنا لاہور میں کسی سکینڈل کی طرح ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

یہ ملٹری کا پولو گراؤنڈ تھا، دور تک پھیلا سبز میدان، ایک طرف پاکستان کا زمین پر رنگا نقشہ اور دوسری جانب چائے پانی کا کیفے۔ فلک گہرا نیلا تھا، ہلکی ہلکی پیروں کو چھوتی دھند موجود تھی اور دوپہر کو اس وقت موسم ٹھنڈا مگر دھوپ نرم گرم سی تھی۔

ایمان گھٹنوں کے پیڈ لگائے سیاہ شرٹ ٹراؤزر میں ملبوس ایک بھورے مائل سفید گھوڑے پر براجمان تھی۔ سر پر ہیلیمٹ تھا اور بال ایک پونی میں بندھے کمر کو چھو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک سیاہ رنگ

کے گھوڑے پر زیب بیٹھا ہوا تھا، سفید شرٹ ٹراؤزر میں ملبوس، ہیلیمٹ کے بغیر لیکن گھٹنوں کے پیڈ لگائے ہوئے تھے۔

”آپ جیل سے کیسے نکلے تھے؟“ ایمان نے ایسے سوال کیا جیسے موسم کا حال پوچھا ہو۔

زیب مسکرایا۔ وہ بس اسے یہاں لا کر خوش تھا۔ ان کا زبانی معاہدہ ہفتے میں ایک بار لازمی ساتھ وقت بتانے کا تھا مگر وہ اسے ہفتے میں دو سے تین دفعہ تک بڑھا چکا تھا۔ اس ہفتے وہ دونوں فورٹریس اسٹیڈیم میں اور اب اس پولو گراؤنڈ میں مل رہے تھے۔ ہر بار ایمان کوئی نہ کوئی ماضی کا سوال کر کے گفتگو کا آغاز کرتی اور زیب بس اس سے باتیں کرتے گزرے وقت کا افسوس زائل کرتا۔

”میرے بھائی نے مجھے جیل سے نکالا تھا۔“ اس نے اتنا سا کہا جیسے یہ جواب کافی تھا۔
 ”وہ کیسے؟“ ایمان کے لب سکڑے۔

”طہ ابرار کا ہائی کورٹ میں ایک جانا مانا نام ہے۔ تین سالوں کی تگ و دو ان کو گوارا نہیں رہی، انہوں نے آخری ٹرائل میں مخالف وکیل کا بیڑا غرق کر دیا۔“ زیب نے سر ہلا کر کیفے میں بیٹھے محافظانِ قوم

کی جانب اشارہ کیا۔ ”میرا آرمی کیریئر کسی حد تک میرے کام آگیا حالانکہ انہیں لوگوں نے مجھے دھتکار دیا تھا۔“

ایمان نے آس پاس لوگوں کو سرتاپا ملاحظہ کیا۔ وہ جتنے جوان تھے، اتنے فٹ، چوکے، محتاط اور ذمہ دار دکھتے تھے۔ جتنے بچ بڑھ جاتے، وہ اپنی وردی کی جگہ سوٹ بوٹ پہننے لگتے اور ان کی بگڑتی جسمانی حالت ان کی ذمہ داری سے محبت کا عکس بن جاتی۔

”آپ کو آپ کے مقدمے کی وجہ سے آرمی سے ہی نکال دیا گیا؟“ اس نے ایک ابرو اٹھایا۔ بات اتنی ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

”صرف اپنے مقدمے کی وجہ سے نہیں۔ دشمن کے چند پیسے، رشوت وغیرہ کا بھی ہاتھ تھا۔“ زیب نے اپنے گھوڑے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے کہا۔

”آپ کا دشمن کون تھا؟“ ایمان نے سوالیہ اس پر نگاہ ڈالی۔

زیب نے اپنے گھوڑے کو جھٹکا دے کر آگے دوڑایا تو ایمان اس کے پیچھے آئی۔ اس کے برابر پہنچتے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”اب فائدہ؟ وہ مر چکا ہے۔“ اس نے تلخی سے کہا۔

”لیکن وہ کون تھا؟“ ایمان مصر تھی۔

”میرا باپ۔“ زیب نے ناگواری سے کہا۔ ”کمال مجاہد۔“

”آپ کے باپ نے آپ کو جیل میں دلوائے رکھا؟“ ایمان نے حیرت سے زیب کو دیکھا۔

وہ کمال کا بیک گراؤنڈ چھان چکی تھی۔ ایک بڑا بزنس مین جو دوسروں کے بزنس کھانے کا شوقین تھا۔ جو

کچھ سال پہلے منظر عام سے غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایچ نامی شخص نے اس کا بزنس سنبھال لیا

تھا۔ وہ چند دن پہلے اسی ایچ سے تو اس شوٹنگ سینٹر ملنے گئی تھی۔ مجاہد شوٹنگ سینٹر۔ وہ کمال مجاہد کا ہی تو

تھا۔

اور وہ زیب کا باپ تھا اور وہ اس کا دشمن بھی تھا اور اس نے زیب کو جیل میں دلوائے رکھا لیکن۔۔۔

کس مقصد سے؟

”کیوں؟“ زیب نے پہلے جواب نہیں دیا تو ایمان نے پوچھا۔

”عزہ کی موت کو کیش کرنے کے لیے اور میری امیج خراب کر کے خود کو ایک مظلوم ضعیف آدمی مشہور کرنے کے لیے۔“ زیب نے اتنے آرام سے کہا جیسے اسے فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ ”پھر بعد میں نازیہ بھی تو ماری گئی تھی، آف کورس اس نے کور اپ تو کرنا تھا۔ اپنے بیٹے کو کیوں نہ بلی چڑھائے؟ ایک بیکار بیٹا جو بزنس سنبھالنے کے بجائے فوج میں چلا گیا تھا۔ وہ فوجیوں سے نفرت کرتے تھے اور اس نفرت کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ہائی رینک والوں کو رشوت دی اور پھر مجھے وہاں سے نکلوا کر اپنی بات ثابت کی۔ وہ کہتے تھے، اور خدا گواہ ہے میرے سچ کا، ’فوجی حرامی ہوتے ہیں۔‘“

ایمان منہ کھولے اس کے ساتھ گھوڑا چلا رہی تھی۔ زیب کچھ دیر تک اپنے والے کو دوڑانے لگا اور پھر وہ دونوں نئے لوگوں میں گم گئے اور کافی دیر بعد اکٹھے ہوئے۔ ایمان اپنا گھوڑا اصطبل میں لوٹا آئی تھی جبکہ زیب کافی دیر تک رائڈنگ کرتا رہا۔ وہ جیسے بات کرنے سے بھاگ رہا تھا کیونکہ جو کہہ گیا تھا وہ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے راز کھولنے کا عادی نہیں لگتا تھا مگر ایمان سے سچ کا وعدہ کر چکا تھا۔

سچ بولنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

”کیا فوجی واقعی۔۔۔“ وہ اپنے ارد گرد موجود مردوں اور ان کی بیوی بیٹیوں کو دیکھتے بولی تھی جب زیب لوٹ آیا تھا۔

”تمہیں لگتا ہر انسان سفید ہوتا ہے؟“ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے بوٹ کے تسمے کھول کر دوبارہ باندھنے لگا۔

”تو وہ سب۔۔۔“

”سب فوجی حرامی نہیں ہوتے۔“ زیب نے سر اٹھایا۔ سنہری آنکھیں سیاہ پڑ رہی تھیں۔ ”جن فوجیوں کے ساتھ میں نے خدمت کی، ان سے زیادہ عزت دار، بہادر اور وطن سے محبت کرنے والے مرد تم شاید کہیں اور نہ دیکھو۔“

”اور وہ سب کہاں ہیں؟“ ایمان نے اس سے نگاہیں ملائے رکھیں۔

”قبر میں ڈالنے کے لیے ان کے جسم باقی نہیں رہے۔“ زیب کہتا کھڑا ہو گیا۔

ایمان دل میں پھلتے سنائے کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لی اور وہ روش پر ساتھ چلنے لگے۔ دونوں نے اپنا گئیر ہیلمٹ وغیرہ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

”میں افغانستان اپنی یونٹ کے ساتھ مقیم تھا۔ تب ہم لوگ مذاق کیا کرتے تھے کہ سیاچن ہو آئے، یہ بھی کوئی چیلنج تھا۔ ان میں سے ایک کا بھی قہقہہ مجھے بھولتا نہیں ہے مگر ان کا باقی سب کچھ بھولنے لگا ہے۔“

زیب ایک جگہ ٹھہر گیا۔ گھوڑے دوڑاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جب وہ یہاں آئے تھے تب زیب ان کی تکنیک پر رائے دے رہا تھا اور نقص نکال رہا تھا۔ اب وہ گم سم سا کھو گیا تھا، کہنے کو صرف اپنی کہانی تھی۔

”میرے برے وقت کی شروعات افغانستان سے ہوئی تھی یا پاکستان زندہ لوٹنے سے، جب میرے ساتھی زندہ نہیں تھے اور میں سانس لے سکتا تھا، خوش رہ سکتا تھا، گزارنے کو پوری عمر گزار سکتا تھا۔ مگر یہ خیالات زیادہ دیر تک میرے ساتھ نہیں رہ سکے۔ میری بہن ایک آگ میں جل کر مر گئی اور مجھے اسی کے قتل کے الزام پر تین سال جیل کا ٹپنی پڑی۔ میرے باپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ بات یقینی بنائی کہ میں جلد باہر نہ نکل سکوں۔ اور تمہارا باپ۔۔۔“

وہ ایمان کی آنکھوں میں رک کر دیکھنے لگا۔ وہ متفر کر دینے کی حد تک جاوید کرمانی جیسی تھیں۔ مگر وہ اپنی بھانجی سے محبت کرتا تھا اور اس کی آنکھیں اسے ایمان کی ہی لگتی تھیں۔

”تمہارا باپ مجھ سے جیل میں ملنے آتا تھا۔ میرے اپنے باپ اور بھائی سے زیادہ۔ اپنی بیوی کو میں نے طلاق دے دی تھی اور بعد میں مجھے اس کی ابارشن کا معلوم ہوا۔ اس دن سنوائی تھی اور مجھ سے میرا باپ مل کر گیا تھا۔ وہ مجھ سے وعدہ کر گیا تھا کہ اس کے بعد زندہ رہنے کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ اس نے انمول کی ای میل مجھے خود پڑھائی تھی جو اس نے مجھے نہیں، غلطی سے میرے باپ کو بھیج دی تھی۔ جیسے یہ معاملہ اتنا سادہ اور آسان ہو۔ تب میں نے طے کر لیا تھا کہ خود کو مجرم قبول کر کے اس ذلت سے چھٹکارا پا لوں گا۔ میں زندگی سے اکتا گیا تھا۔“

وہ ابھی بھی زندگی سے اکتایا ہوا ہی لگتا تھا لیکن ایمان نے یہ نہیں کہا۔ محض روش پر اس کے ساتھ گیٹ سے چند فٹ دور کھڑی رہی۔ درد میں، جانے کیسے اس کا درد محسوس کرتے۔

مگر وہ خون نہیں تھا؟

زیب اس کا واحد خونی رشتی تھا جو سانس لیتا موجود تھا۔

”تب تمہارے باپ نے مجھے روکا تھا۔ اور اس پل اس نے مجھ سے ایک فقرہ کہا تھا جو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ تب میں ہنس دیا تھا کیونکہ مجھے لگا تھا وہ میری زندگی کو استہزاء سے دیکھ رہا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔“

”انہوں نے کیا کہا تھا؟“ ایمان شاید اندازہ کر سکتی تھی، شاید نہیں۔ ایک ہی تو فقرہ تھا۔

”نہیں، اس نے مجھ سے وہ سکیٹل والی لائن نہیں کہی تھی۔“ زیب ہنستے ہوئے باہر نکل گیا اور ایمان اس کے ساتھ پارکنگ میں کھڑی ان کی کار تک چل دی۔

”پھر؟“ وہ تجسس سے بولی مگر زیب پر اسرار سا مسکرا دیا۔

”اگلے ہفتے کسی نئی جگہ ملیں گے تب بتاؤں گا۔“

”ماموں!“

☆☆☆

دنیا سیاہ تھی۔

روشنیاں سنہری۔

ہجوم سرمئی۔

ایک تیز سفید جھلک اور رنگوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔

ایکسپو سینٹر کے باہر ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کیمروں کے فلیش، صحافی، اداکار، بزنس ممبران، زمین پر بچھا ریڈ کارپٹ اور گہرا نیلگوں آسمان۔

فن کار، فریب کار، سیاہ کار۔ فلک تلے سب جمع تھے۔

اس کا ہڈ اس کی چمڑے کی وردی کی طرح سیاہ تھا۔ سفید ابرو کے نیچے جمادیتی سرد آنکھیں، ایک نیلی ایک بھوری، دونوں سرخ متورم۔ ایک دستانا چڑھا ہاتھ لبوں تک اٹھا، برہنہ انگلیوں کے بیچ سگریٹ تھا۔

سلگتی چال والی عورت نے سایوں کے بیچ راستہ بناتے کش بھرنے شروع کیے۔

سر پر ہڈی گرائے انگارہ نظروں پر پردہ ڈالتے، وہ آہستہ سے تاریکی میں غوطہ لگا کر منظر سے تحلیل ہو گئی۔

☆☆☆

ایمان سرخ بھبھوکا چہرے کے ساتھ اپنے آفس میں داخل ہوئی۔ فون اٹھا کر بک شلف میں ایک کتاب کے ساتھ رکھ دیا، گلے سے سکارف نکالا اور دوبارہ لپیٹ کر پہنا، سیاہ کھلے بالوں کو اندر بند کرتے باندھ لیا۔

”لوگ مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ وہ گھوم کر اپنی دوستوں سے بولی۔

ابھی ابھی وہ دو ڈیپارٹمنٹ مینیجرز سے لڑ کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے انہیں فائر کر دینا تھا اگر ان کی کمال پراگریس اور کمپنی کے لیے فائدہ مندی کا ڈیٹا عوں نے اس کو ازبر نہ کروایا ہوتا۔ اسسٹنٹ بھی ہو تو ایسا۔

مگر وہ ایک سی ای او تھی جو اپنی مرضی کا کام نہیں کر سکتی تھی۔ خود مختار، ہونہ۔ وہ کیسی خود مختار تھی کہ ان لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا؟

”وجہ سادہ ہے۔ آپ ہمیشہ سے بے باک رہی ہو۔“ لاریب گلابی حجاب پہنے ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔

”جو بات ذہن میں ہے وہ کہہ دی۔ کبھی تعلقات استوار کرنے کے لیے معاملہ ”نہی کا خیال نہیں رکھا۔“

”معاملہ فہمی نہیں منافقت۔ میں منافق نہیں ہوں۔ غلط لوگوں کو ان کے منہ پر غلط کہہ کے ان سے دور رہنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ میں ان پر انحصار کروں۔ میرے باپ نے مجھے یہ نہیں سکھایا۔“ ایمان نے انگشت شہادت اٹھا کر سختی سے کہا۔

”تمہیں یاد بھی ہے تمہارے باپ نے تمہیں کیا کچھ سکھایا تھا؟“ آیان نے سرخ بال گردن سے جھٹکے۔
 آج ایک سفید بگی شرٹ اور سیاہ سلیکس میں ملبوس، ذرا لمبی مگر اچھے مزاج کی لگ رہی تھی۔
 ایمان اس کی بات پر ٹھٹھک گئی۔ پھر ناک اٹھائی، مغرور طرز۔

”مجھے یاد نہ بھی ہو، میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں انہوں نے میری تربیت ایسی ویسی نہیں کی۔“ اس نے دروازے کو گھورا جس کے باہر وہ سارا سٹاف تھا جو اسے گھورنے میں اپنا وقت بتاتا تھا۔
 آیان نے لاریب کو سوالیہ دیکھا تو لاریب نے سر اثبات میں ہلایا۔

”ہاں، اس کے ڈیڈ ایک اچھے باس تھے۔ سننے میں تو یہی آیا ہے، میں نے انہیں صرف میڈیا پر دیکھا ہے۔“ میڈیا کا کرمانی، اپنی زندگی سے لے کر موت تک مشہور رہا ہے۔“

ایمان کی پاور سیٹ کے پیچھے سے کھڑکیوں کے پردے وا تھے، تیز روشنی اندر آرہی تھی، موسم کی خنکی واضح تھی۔

”اور اس کے بعد؟“ ایمان نے دھیرے سے کہا۔

”موت کے بعد کسی کو کون یاد رکھتا ہے؟“ لاریب نے جیب سے فون نکالا اور ایمان کے ڈیسک پر چند کتابیں اور ہائی لائٹرز رکھ کر اس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ایک تصویر لیتے ہیں۔ آپ کا سوشل میڈیا کافی عرصے سے بند پڑا رہا ہے۔“

ایمان نے موضوع بدلے جانے پر کچھ نہ کہا اور جگہ پر بیٹھ گئی۔ آیان نے اس کا دل بیٹھتے ہوئے جیسے دیکھ لیا تھا، اپنے تجسس کے باوجود نہیں کریدا۔

آخر جاوید کرمانی کون تھا؟

اس کی اپنی بیٹی کو نہیں معلوم تھا۔

ایمان مصنوعی مسکرائی اور کیمرے کی آنکھ میں دیکھا۔ لاریب نے تین چار کلکس لینے کے بعد تصویر کی ایڈیٹنگ شروع کر دی۔ ”back to work“ کے ہیش ٹیگ کے ساتھ پوسٹ کر دیا۔

ایمان یونہی سر جھکائے اس کتاب کو دیکھنے لگی جو لاریب نے اس کے ڈیسک پر رکھی تھی۔ سیاہ جلد کی کتاب، جس پر جامنی گلابی رنگ میں لکھا تھا 'Feminism Against Progress'۔

ایمان کی بھنویں بھیج گئیں۔

”کیا میرے ان پاپولر ہونے کی وجہ یہ ہے؟“ وہ اس کتاب کے صفحے پلٹا رہی تھی جس میں سٹکی نوٹس کا انبار تھا۔ کچھ سبز، اتفاق میں۔ کچھ سرخ، نفاق میں۔ اور حاشیے میں لکھے نوٹس، وہ بھی تھے۔

لاریب پوسٹ کر کے فارغ ہو چکی تھی، اب وہ واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ کے کام سے لوٹنا چاہتی تھی، ایمان کے سوال پر مصروف سا بولی۔

”تم بے باکی سے ایکٹرز ایکٹریز اور ہر طرح کے پبلک فگر سے فیمینسٹ ہونے پر بحث کر چکی ہو۔ ایک اچھی بات ہے، تم ان سے لڑتی نہیں، تمیز سے اپنے حصے کی بحث پیش کرتی ہو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ

انہیں بحث کرنی نہیں آتی۔ وہ دلائل سے اپنی بات نہیں منوا سکتے اس لیے تمہارے خلاف پراپیگنڈہ کر

کے اپنی 'فیلنگز' کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔“ لاریب اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”انہیں اپنے

پیسے کے بنڈل عزیز ہیں اور ایلٹ کلاس کی عورتوں کو ویسے ہی معاشرے کی بد حال عورتوں کی گردن پر

پیر رکھ کے اپنے مسائل اجاگر کرنے کا شوق ہے۔ تم پہلی لڑکی ہو جو انہیں میں سے ہو کر ان کے خلاف بولتے نظر آئی ہے۔“

ایمان اپنے فون پر اپنے اکاؤنٹ اور انٹرویوز وغیرہ کھول کر دیکھنے لگی، ایسا بھی کیا تھا جو وہ کہتی تھی۔ پھر وہ ٹھہر گئی، لاریب کی باتوں پر، اس کے انداز پر۔

”یعنی مجھ سے انصاف پسند، لاجیکل اور نارمل ہونے پر نفرت کی جاتی ہے؟“ وہ خاموشی سے گویا ہوئی۔
لاریب ٹھٹھکی۔

”ہاں۔“

ایمان جاوید سے سائیکو ہونے کے بجائے نارمل ہونے پر نفرت کی جاتی تھی۔

انسان کو اصل صدمہ تب پہنچتا ہے جب اس سے اس کی خامیوں کے بجائے اس کی خوبیوں کی وجہ سے نفرت کی جائے۔

”ایک فیمنسٹ کون ہوتی ہے؟“ آیان اپنی کلائی کو مسلتے چل رہی تھی، پر سوچ، نرمی سے استفسار کیا۔

ایمان نے ایک گہرا سانس لیا، وہ لوگوں کی نفرت پر خود ترسی کا وقت بعد کے لیے محفوظ رکھے گی۔

ڈپریشن میں گزارنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اور وہ خود کو وقت بعد میں دے گی۔

”خود کو ایک فیمینسٹ کہنے کی غلطی نہیں گناہ کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ وقت بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ثقافت بھی، آرٹ، ادب، موسیقی اور زبان بھی۔“ وہ اپنے ڈیسک پر کہنیاں جما کر، ہاتھ آپس میں ملا کر سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ ”انگریزی لفظ تھا، ‘country’۔ اس کا مطلب گاؤں ہوا کرتا تھا۔ اب اس کا مطلب ہمارا یہ ملک ہے جس کے ہم شہری ہیں اور جس سے نفرت کرتے، اسے بے عزت کرتے اور بے غیرتوں کی طرح اس کی برائیاں پھیلاتے ہم تھکتے نہیں۔ اب ہم لفظ کنٹری کو گاؤں کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ وقت کے ساتھ مطلب تبدیل ہو چکا ہے، جذبات بدل گئے ہیں، تاریخ جو بھی تھی، حال وہ نہیں ہے۔ برا لفظ استعمال کر کے اچھا معنی مراد لینا بیوقوفی ہے۔“

اس نے اس کتاب کا ایک صفحہ کھولا، اندر ایک باب تھا، ‘Let Men Be’ یعنی مردوں کو سانس لینے

دو۔

جیو اور جینے دو۔

”کئی دہائیوں پہلے جب امریکہ اور یورپ میں عورت کو ایک شو پیس کی حیثیت حاصل تھی اور عرب ممالک میں وہ یونیورسٹی فائونڈرز بن رہی تھیں، تب ان لوگوں نے اس تحریک کا آغاز کیا۔ عورتوں کے حقوق کی پامالی سے نجات پانے کے لیے۔ اچھی نیت سے شروع کیا گیا کام، خالص سچ سے پھیلا یا گیا مقصد۔ مگر آج کے دور میں کہانی مختلف ہے، لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں اور لوگوں کی نیتیں بھی۔“

ایمان کے ذہن کے پردے پر کئی ایسے لوگوں کے نام گزرے، ایسے مشہور امیر لوگ جو اس سے کم کماتے تھے، اس سے کم ہنر مند تھے، اس سے کم پڑھے لکھے اور مشکلات سے گزرے تھے۔ مگر وہ لوگ خود کو ایک فیمینسٹ کہتے تھے اور ’حقوق، حقوق، حقوق‘ کا نعرہ بلند کرتے تھکتے نہیں تھے۔

”تم نے سوشل میڈیا پر ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی۔ ان کے کئی پروفیشن ہیں۔ بزنس وومن، ایکٹریس، انسٹاگرام انفلوئنسر، سٹرانگ وومن، باس لیڈی، ’آئی ڈونٹ نیڈ اے مین‘ جیسے فقرے کی وکیل خواتین۔ مطلب جاہل عورتیں۔“ ایمان نے سفاک سچائی سے کہا۔ ”پاکستان میں ایسی عورتیں 20% کے برابر بھی نہیں ہوں گی۔ مگر کیونکہ سوشل میڈیا پر وہی امیر، مشہور عورتیں نظر آتی ہیں اور کیونکہ معاشرہ ہمیشہ اپنے رؤسا کے آگے دب کر رہتا ہے اور انہیں کی پیروی کرتا ہے، اسی لیے سب انہیں کی سنتے ہیں، انہیں سے سیکھتے ہیں۔ ان خواتین کا مقصد ہے پیسہ کمانا۔ ان کے نزدیک شادی ایک قید ہے۔ ان کے

نزدیک مرد جانور ہیں۔ ان کے نزدیک مضبوط اور باوقار ہونے کا مطلب غلط ہونے پر بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا، معافی نہ مانگنا، دوسروں کو خود سے کمتر محسوس کروانے کے لیے اپنی شہرت، پیسے اور مرتبے کو ان کے منہ پر جوتے کی طرح مارنا ہے۔ اگر خدا نخواستہ وہ کسی اچھے موضوع پر سمجھداری سے بات کرتے دکھ جائیں، تو کچھ دیر بعد تمہیں معلوم ہو وہ ایک رٹی رٹائی سکرپٹ پڑھتے ہوئے اپنا پراڈکٹ بیچ رہی تھیں۔ اب وہ پراڈکٹ دین ہو، دنیا ہو، یا ان کا اپنا جسم اور روح ہو، یہ ان کی آزادی طے کرے گی۔ اور ہاں، ان کی پیسے کی چاہ۔“

آیان تجسس بھرے سکوت میں ایمان کے ڈیسک سے کمر لگائے اسے سن رہی تھی جبکہ لاریب اس کو ریکارڈ کر رہی تھی، کسی اچھے دن سوشل میڈیا کی ریچ بڑھانے کے لیے پوسٹ کر دے گی۔

”خود مختار ہونا ایک انسان کا حق ہے۔ عورت اور مرد دونوں انسان ہیں۔ مرد کو دین میں برتری اور فضیلت سے زیادہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ پاکستان میں 80% مقدمے اصل مصائب جھیلنے والی عورتوں کے ہوتے ہیں۔ مگر مرد ان بیس فیصد کو دیکھ کر دیکھ کر سکتا جاتے ہیں اور اپنی عورتوں پر ظلم کرتے ہیں تاکہ وہ اٹھ کر ویسا ہی گھٹیا اور مکار بول نہ سکیں۔ اور ہماری لڑکیوں کا الگ حال ہے۔ وہ سوشل میڈیا پر غلط عورتوں کو اپنا رول ماڈل بنا لیتی ہیں۔ ایسی عورتیں جنہوں نے زندگی میں حقیقی سٹرگل نہیں دیکھی، جو

آسائش میں پیدا ہوئیں اور جن میں اتنی سمجھ بوجھ یا تخیل کی وسعت نہیں کہ وہ کم از کم خود سے کمتر کو سمجھ سکیں۔ ایسی عورتیں قابلِ ترس ہوتی ہیں۔ ان کے خلاف نہ بولنے والے قابلِ نفرت۔“

”قابلِ نفرت کی سمجھ آتی ہے، غیر جانبدار لوگ دنیا کی سب سے گندی نسل کے ہوتے ہیں۔“ لاریب نے سکون سے مداخلت کی۔ ”نہ ادھر کے نہ ادھر کے، جنگل میں وہ لومڑی جسے بعد میں دونوں شیر اور چیتے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ مگر قابلِ ترس کیسے؟“ وہ اس کی سب باتوں سے اتفاق نہیں کرتی تھی خاص طور سے اتنا آرام سے ایسی عورتوں کو جاہل قرار دے دینا۔ مگر اسے بحث کے اصول معلوم تھے۔ احترام سے سن کر جواب دینا، مزید سوال کرنا، بحث جاری رکھنا۔

”ایک ایسی عورت جس نے ساری زندگی مردوں سے نفرت کرتے گزاری، جو ایلٹ کلاس سے ہے اور کبھی جائز وجہ سے مرد کے خلاف نہیں ہوئی، اور جائز وجہ ہو تب بھی ہر مرد نہیں صرف اپنے گنہگار کے خلاف ہوا جاتا ہے۔ ایسی عورت جس کے باپ اور بھائی اچھے مرد ہیں مگر وہ ایک اچھی عورت نہیں۔ کیا کوئی اس سے شادی کرے گا؟ اگر کسی نے اس سے شادی کر لی، وہ اس کو زیادہ دیر بچا سکے گی؟ اگر اس کے بچے ہو گئے تو کیا وہ اس کو پسند کریں گے؟ کیا ایک عورت اپنے خاندان کے بغیر خوش رہ سکتی ہے؟ بات ضرورت کی نہیں ہے نہ ہی کسی پر انحصار کرنے کی۔ بات چاہت کی ہے۔ کوئی انسان تنہا نہیں

رہنا چاہتا، یہاں مرد اور عورت ایک دوسرے کی نفرت میں ایک دوسرے کے بغیر جینے کو ترجیح دینے لگ گئے ہیں۔ جبکہ یہ سائنس چھوڑو، جذباتی لحاظ سے بھی ناممکن ہے۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ ایک عورت ایک مرد کے بغیر جی ہی نہیں سکتی؟“ آیان نے ایک دم سوال کیا۔

”اس معاشرے میں جہاں ہم رہ رہے ہیں، عورتیں پہلے ہی غلامی کرتی ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم جیسے یا مجھ جیسی انہیں بیس فیصد میں سے ہیں۔ نہ ہونے کے برابر۔“

”نہیں۔“ ایمان نے ایک ابرو اچکایا۔ ”عورت اور مرد ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت بات ہے۔ قدرتی، نارمل۔ کسی بھی عورت کو جذباتی، نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی طور پر طاقتور ہونا چاہیے جتنا وہ اپنی بائیولوجیکل حدود میں رہ کر ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ پر افسوس کے ساتھ وہ مر جائے گی۔ خود مختار اور آزاد ہونے کا مطلب اکیلے رہنا نہیں ہے۔“ ایمان نے یہ جملہ کہا تو آیان اور لاریب دونوں کی آنکھوں میں کچھ ابھرا۔ جیسے کچھ نیا معلوم ہونے پر سمجھا ہو۔ ”معاشرے کی مضبوط ہونا اور اپنا خیال رکھ پانا ہر عورت کا حق اور ضرورت ہے۔ مگر یہ اس کی ذمہ داری نہیں، خاص طور سے اگر وہ ایک ماں ہے۔ ورنہ سوچو وہ اپنا اور اپنے بچے کا خیال رکھے گی یا کام پر جائے گی؟ اور بالفرض وہ اپنے بچے کو ہفتے میں چھ دن کسی نرسری چھوڑ آتی ہے تو اس کا بچہ کبھی بھی ٹھیک سے بڑا ہو سکے گا؟ اس

سے محبت کرے گا؟ اس کے ویسا قریب ہو پائے گا جیسے اولاد ماں کے ہوتی ہے؟ جب عورت ماں بن جاتی ہے تو اس کا سب سے بڑا مقصد مامتا ہوتا ہے۔ اور ایک نئے انسان کی پرورش اور اس کی شخصیت کو نکھارنا دنیا کے سب سے عظیم مقاصد میں سے ایک ہے۔“

”اور جو ماں نہ بننا چاہتی ہو؟ جس کے مقاصد میں گھر بنانا نہ ہو؟“ آیان نے گردن ترچھی کرتے کہا۔
چہرے پر خاموشی رقم تھی۔

”خواہشات بدل جاتی ہیں۔ انسان وقت کے ساتھ میچور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی تربیت اچھی کی جاتی ہے تو ان کی شخصیت ایسی ہو جاتی ہے یا وہ کتابوں اور کہانیوں اور باتوں سے سیکھ جاتے ہیں۔ ہر ایک کا وقت آتا ہے۔“ ایمان نے اپنا جواب دیتے لینڈ لائن اٹھائی اور کمرے میں پانی کا گلاس اور دو جوس منگوائے۔

جب پیون وہ سب اس کے ڈیسک پر رکھ گیا تو وہ پانی جگ سے گلاس میں بھر کر پینے لگی۔ گلاس خشک پڑ گیا تھا۔

آیان اور لاریب جوس پی رہی تھیں جب ایمان نے سلسلہ کلام جوڑا۔

”مس ہوشیم کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور وہ پرانے زمانے کی ایک کردار ہیں۔ جانتے ہو برائی کب واضح ہوتی ہے؟ جب وہ پیالے میں پانی کی طرح اتنی بھر جائے کہ باہر نکلنے لگے۔ فیمنیزم عرصہ دراز سے نجس ہو چکا ہے مگر دکھنا اب شروع ہوا ہے۔ جسم فروشی بھی کوئی حق ہے مانگنے والا؟ اصل مسائل سے دو چار عورتیں اپنے مسائل بھلا کر ان بگڑی ہوئی ایلٹ عورتوں کی وومن ایمپاورمنٹ تقاریر سن کر جوش پکڑتی ہیں اور اندھوں کی طرح ان کی سنتے ہوئے سر ہلاتے جاتی ہیں جیسے وہ واقعی کوئی عقل و فہم کی بات کر رہی ہوں جسے پسند کیا جانا چاہیے۔“

”کہہ تم ٹھیک رہی ہو مگر لوگ نہیں سمجھتے۔“ لاریب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”انہیں ان کے سلبرٹیٹیز اور ہمیشہ سے رہے آئیڈیلز پسند ہیں۔ وہ اتنی آسان سے ان کو ٹوٹتے برداشت نہیں کر سکتے۔ زیادہ تر ان کی محبت میں اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔“

”ایسے لوگوں کی مثال جانتی ہو کیسی ہے؟“ آیان اس کی جانب کھڑے کھڑے مڑی۔ ”جب کوئی اپنی مخالف سیاسی پارٹی کے اجلاس میں شرکت کرتا ہے اور مزے سے بتاتا پھرتا ہے کہ میں تو بس بریانی کھانے گیا تھا، ووٹ اپنے ہی لیڈر کو دوں گا۔ ایسے لوگ جو جنگ کے سبب خاموش، مسائل آنے پر

جھوٹے، مکار اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ جن کے لیے ایک مقصد اور عزم اہم نہیں ہوتا بلکہ۔۔۔ بلکہ

صرف اپنا آپ اہم ہے۔“ آیان کے ہاتھوں کی نسیں ابھر رہی تھیں۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔

”لوگوں کا مسئلہ خاموش رہنا، علم کی ناقدری کرنا اور لاجک اور عزت دونوں کو کہیں پھینک کر ’میں،

میں، میں‘ کرنے لگ جانا ہے۔“ ایمان نے کہہ کر جیسے معاملہ ہی ختم کر دیا۔

آیان اس سیاہ جلد والی کتاب کو کھول کر پڑھنے لگ گئی جبکہ لاریب باہر کام سے چلی گئی۔ ایمان ایک

فائل کھول کر پڑھنے لگی، ساتھ لیپ ٹاپ آن کر کیا تاکہ ایک میلز دیکھ سکے۔ لاریب کے لوٹنے تک وہ

اور آیان اپنے اپنے کاموں میں محو ہو چکی تھیں۔

”آپ نے یہ سوچا ہے کہ آپ اپنے ذاتی مسائل کیسے حل کرو گی؟“ لاریب نے پوچھ کر ایمان کو

چونکاتے اس کے سامنے ایک کرسی پر جگہ لے لی۔ ”آپ کی یادداشت جا چکی ہے، آپ کسی کو نہیں

جانتی اور مجھے اور عون کو بار بار آپ کو کسی غلط انسان کو فائر کرنے سے روکنا پڑتا ہے۔ یہ سب کب تک

چلے گا؟“

ایمان نے فائل ایک طرف کی، لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے لڈ گرا دی۔ مٹھی میں ایک سرخ پین پکڑتے اس نے اس کو دبایا۔ نب باہر آتی، پھر اندر جاتی۔ باہر، اندر۔ کلک، کلک۔ پھر ایک نقطے پہ آکر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ اس کا پورا وجود ساکت تھا، سر ٹیڑھا، لب پیوست، بند۔

”سازشی مسکراہٹ۔“ لاریب نے فون سے تصویر کھینچی۔

”میں تمہارے ذہن کے پیسے چلتے ہوئے سن سکتی ہوں۔“ آیان نے ناگواری سے کہا۔

”وہ سب کچھ جانتا ہے!“ ایمان نے پین ہولڈر میں پین ڈالتے تالی بجائی۔ ”وہی تو سب کچھ جانتا ہے۔“

آیان اور لاریب نے نظریں ملائیں۔ خیالات ایک تھے۔

لڑکی سٹک گئی ہے۔

”کون سب کچھ جانتا ہے؟“ لاریب نے شائستہ رہنے کی سعی میں سوال کیا۔ اس کا پارہ جلد اوپر جانے والا تھا۔

”اس کا منگیتر، اور کون۔“ آیان نے غیر ضروری ’ہونہہ‘ کیا۔

ایمان ڈیسک سے اٹھی اور کمر پر دونوں ہاتھ جماتے، نیلا کوٹ خود سے بھینچ لیا۔

”مومن ابرار کو ماضی معلوم ہے۔ علم طاقت ہے اور اس کے پاس ماضی کا سارا علم ہے۔ وہ مجھے مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ وجہ سٹانگ یا آبسیشن نہیں ہے، صرف اور صرف ہماری یادداشت کا فرق ہے۔“ اس نے ماتھے سے بال ہٹائے، وہ زخم دکھایا جو اسے اپنے حادثے سے ملا تھا۔ ”میں نے یادداشت کھو دی، میں نے اپنی طاقت کھو دی۔ میرے انٹرویوز اور آرٹیکلز اور کام سے صاف ظاہر ہے، میری لانگ اور شارٹ ٹرم میموری میری طاقت تھی۔ ایک حادثے نے وہی سب مجھ سے چھین لیا اور میں سکورن پر واپس آ گئی۔“

”آپ چاہیں تو میں آپ کو بہت کچھ بتا سکتی ہوں، آپ کی ورک اینتھک اور انصاف پسندی سے لے کر۔۔۔“ لاریب آگ بگولہ ہو کر بولی تو آیان نے ایک ہاتھ چہرے کے سامنے کر دیا۔ اتنی تیزی سے کہ لاریب رک گئی۔

”ایمان، تم نے اس سے ایسا کیا جانتا ہے؟“ سرخ بالوں والی لڑکی نے سناٹا چھوڑنے والا سوال کیا۔

”اس کی ماں کا کیس۔ ان کا میرے ڈیڈ اور جلنے والی ماں سے تعلق۔ اور دوسری سٹیپ مام بھی جو ڈیڈ کی ہی طرح گولیوں میں بھون دی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ مروارید ابرار والا چکر۔ اس کا اس سب کیا لینا دینا

ہے۔ اور سب سے بڑھ کر، وہ میرا منگیتر کس خوشی میں ہے، میں نے اس کو اپنا مینیجنگ ڈائریکٹر کیوں بنایا؟“

”ورک پلیس رومانس؟“ لاریب نے بھری ہوئی سرگوشی کی۔

ایمان نے سوچتے ہوئے سر ہلایا، جیسے سمجھ سکتی ہو۔

”وہ ہینڈ سم اور سمارٹ ہے۔ اسے بات کرنی آتی ہے اور لاجواب کرنا بھی۔ وہ ایک مصور اور مستقبل کا وکیل ہے۔ سمجھدار، گہرا سوچنے والا، دل کی سننے والا، تمیزدار، شائستہ۔ کیا میں نے کہا وہ کتنا ہینڈ سم ہے؟ اسے پسند کرنا بنتا ہے۔“ ایمان نے سادگی سے کہا۔ ”مگر وہ مجھے زہر لگتا ہے۔ اس کو میں نے اپنا ایم ڈی کیوں بنایا؟“

وہ مومن کے اوصاف گنوانے کے بعد اتنے غصے سے بولی کہ لاریب اپنی جگہ سے اچھلی۔ ایمان نے اس کے ہاتھ سے پھسلتا کیمرہ پکڑا اور آفس کی ایک دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ پر سکون، خاموش، فاختہ جیسی۔

”تو اب کیا کرنا ہے؟“ اس نے جیب سے اپنی چھریاں برآمد کرتے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مارنا شروع کر دیا۔ لوہے کا ٹکراؤ سماعت میں بازگشت کرنے لگا۔

”وہ میرا کرائم پارٹنر بنے گا!“ ایمان نے ہاتھ آپس میں ملے۔ جیسے کوئی شیطانی خیال آنے پر خوش ہوئی ہو۔ مسکراہٹ معصوم تھی، خوشگوار۔ ”میں اور وہ مل کر ان قدموں کی تہہ تک پہنچیں گے۔“

”مجھے شادی پر ضرور بلانا لیکن ابھی نیپیرہ کے ساتھ مجھے کام ہیں اور تمہاری کمپنی کے ہی کام ہیں اور میں اپنی روزی حلال رکھنا چاہتی ہوں۔“ لاریب نے مصروفیت سے کہا اور دروازہ ٹھک سے کھول کر بند کرتی وہاں سے چلی گئی۔

”اس کے بارے میں ایک ایک بات بتاؤ۔“ آیان نے دلچسپی سے کہا۔

ایمان جوش سے مسکرائی اور تقریباً اچھلتے ہوئے اس کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھی۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔

کاش جو مومن کو معلوم ہوتا۔۔۔

☆☆☆

”ایک محنتی تاجر کا خاندانی رؤسا کی محفل میں کیا کام ہو سکتا ہے؟“ میڈیا کے کرمانی نے ایک حساس سوال اپنی ازلی بے حسی سے کیا۔

دونوں کرمانی جاوید کی لینڈ کروزر میں بیٹھے تھے۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا اور ایمان اس کے بائیں جانب بیٹھی کھڑکی سے باہر لاہور شہر کی مصروفیت کا نظارہ کر رہی تھی۔ ستاروں جیسی چمکتی عمارات، تاریک سمندر میں روشن موتیوں کے جیسی سڑک پر چلتی گاڑیاں۔ اس نے ٹھنڈی فضا کو اپنے چہرے کے ساتھ کھیلنے دیا، جاوید کے سوال کو اپنے ذہن میں اٹھانے دیا۔

”خیرات۔ صدقہ۔ زکوٰۃ۔“

جاوید نے ایک ابرو اٹھایا۔

”تمہیں نہیں لگتا اس کام کو ٹی وی پر نشر کرنا جبکہ اس میں سے نوے فیصد پیسہ انہیں لوگوں نے آپس میں جوئے اور سٹے بازی میں کھا جانا ہے، تھوڑا۔۔ غلط ہوگا؟“

ایمان نے سنجیدگی سے اس کی جانب رخ کیا۔ بالوں میں ایک سرمئی ربن تھا، ورنہ وہ کھلے ہوئے تھے۔ اپنے ڈیڈ جیسے ایک سفید لمبے کوٹ میں ملبوس، اس کے کپڑے نہیں دکھتے تھے۔

”بس تھوڑا، ڈیڈ؟“

”آخر ہمیں ٹیکس دینے کی یہ نوبت ہی کیوں پڑتی ہے؟ صرف زکوٰۃ کافی نہیں تھی؟“

”آپ اپنے پیسے کیا سنبھال کر رکھنا چاہتے ہیں؟“

”کیوں نہیں، میں نے محنت سے کما کر یہ حق نہیں جیتا کیا؟“

”ٹیکس سب دیتے ہیں۔ یہ ہر انسان پر لازم ہے۔“

”سب نہیں دیتے۔ قانون ہے ہی نہیں۔“

ایمان کو مومن کی باتیں یاد تھیں جو وہ دہراتے رہنے کا عادی تھی۔ سچائی، وفاداری، اعتبار ہمیشہ۔

وہ اور اس کے اصول، ہر قانون کو طاقت دیتے ہوئے۔

”قانون ہے، ڈیڈ۔ لیکن قابو میں نہیں رکھ سکتا ان انسانوں کو۔ اصولوں کو لاگو ہی نہیں کیا جاتا ورنہ وہ

یہاں کھڑے ہیں۔ یہ ہر پاکستانی کی انفرادی نااہلی ہے۔ ٹیکس ہے اور سب پر ہوتا ہے، ادا سب بے شک

نہ کریں۔ ہم پر اپنے حصے کی ذمہ داری واجب ہے۔“

دو ہزار اٹھارہ، نومبر کی سات تاریخ۔

جاوید نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور ایک خراب اشارے پر گاڑی روک دی۔ کسی کا حادثہ ہوا تھا اور لوگ وہاں جمع تھے۔ اس نے ایک باہر والے شخص سے صورتحال دریافت کی تو پتہ چلا نوجوان لڑکا موٹر بائیک stunt کر رہا تھا اور اپنی نادانی میں اس نے ایک فیملی کی گاڑی کے سامنے والے شیشے کو توڑ دیا تھا۔ ماں باپ زخمی تھے، بچے محفوظ۔

وہ دونوں فوراً سے باہر نکل گئے۔ ایمان نے ایمبولینس کو فون کیا تھا جبکہ جاوید نے ویڈیوز بنانے والے لڑکوں کو کانوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹایا تھا۔ ایک بزرگ خاتون ان گھر والوں کو دلا سے دے رہی تھیں۔ ایمبولینس کے آنے تک باپ بیٹی وہیں کھڑے رہے، اپنے امیرانہ طرز کے کپڑوں میں الگ تھلگ سے دکھتے۔

ایمان کا کھلے بالوں میں لگا سرمئی ربن جاوید کی سرمئی ٹائی جیسا تھا۔ دونوں نے ایک جیسے لمبے سفید کوٹ زیب تن کر رکھے تھے۔ ایمان نے ایک سفید سکرٹ جبکہ جاوید نے سفید پینٹس۔ دونوں کے مکاسن شوز سیاہ تھے۔ سرمئی آنکھیں ہمیشہ کی طرح ترش تھیں البتہ مسکراہٹیں نرم اور مددگار تھیں۔

ایمبولینس کے پہنچ جانے کے بعد وہ دونوں واپس اپنی گاڑی میں چلے گئے۔ انہیں فوراً پہنچنے کی جلدی نہیں تھی، جاوید ہر ایونٹ پر آخر کے پندرہ منٹ میں اینٹری دے کر واپس گھر پہنچنے کا عادی تھا۔ اسے مصنوعی لوگوں میں رہنا شدید ناگوار گزرتا تھا۔

اور ویسے بھی، طہ ابرار سچ کہتے تھے۔

ہمیشہ کی طرح لیٹ، کرمانی۔

”ایک قصہ سناتا ہوں تمہیں۔ تب تم میری بات سمجھو گی۔“ اس نے کار سڑک پر لاتے کہا۔

ایمان کی مسکان بے ساختہ تھی، بے خیال سی۔ جاوید جب کبھی کوئی قصہ سناتا تھا، اس کا پورا وجود کان ہو جاتا تھا۔

”ایک بادشاہ جنگل میں شکار پر نکلا لیکن تم کیا دیکھتی ہو، وہ کھو گیا۔ بھٹکتا بھٹکتا وہ ایک جھونپڑی تک آ

پہنچا اور وہاں رہنے والے ایک بزدل کے ہاں سوالی ہو گیا۔ بزرگ نے اسے خاطر داری سے اپنے پاس

بٹھایا اور پوچھا کہ یہاں کیسے آئے ہو؟ بادشاہ نے کہا کھو گیا ہوں، آرام کرنے کے لیے رک گیا ہوں۔

پانی ملے گا؟“

جاوید نے اسے یہ کہانی پہلے بھی ایک بار سنا رکھی تھی۔ وہ بھول جاتا تھا مگر ایمان نہیں بھولتی تھی۔ اسے اپنے باپ کی ہر کہانی از بر تھی۔ اور وہ اسے سننے سے پہلے ہی مدعا سمجھ گئی تھی۔ لیکن اس نے اسے بیچ میں نہیں ٹوکا کیونکہ دوسری بار سننے پر پہلے کا سیکھا گیا سبق تازہ ہو جاتا تھا اور ایک انوکھی سی برداشت اس کی فطرت میں گھل چکی تھی۔

”بزرگ نے کہا، تم تو مہمان ہو۔ پانی کیوں، میں تمہیں انار کا شربت پلاتا ہوں۔ انہوں نے ایک انار نچوڑ کر گلاس بھرا اور بادشاہ کے آگے پیش کیا۔ بادشاہ کو وہ بڑا لذیذ لگا اور اسے خیال آیا کہ یہ اسی کی تو سلطنت ہے جہاں اتنے شاندار باغات موجود ہیں، اتنے عمدہ پھل لگتے ہیں۔ وہ بھی مفت۔ ان کے استعمال پر وہ کوئی قیمت کیوں نہیں لگاتا؟“

یہاں سے معاملہ بگڑا تھا۔ جب ساتھ لے کر چلنے والے الگ سے اپنا سوچنے لگ جاتے ہیں، تب تباہی کے امکان مضبوط ہو جاتے ہیں۔

”بس اس خیال کا گزرنا تھا اور اس کا شربت ختم ہو گیا۔ اس نے بزرگ سے ایک اور گلاس کی فرمائش کی۔ بزرگ اٹھے، ایک انار نچوڑا اور رس نکالا۔ گلاس نہیں بھرا۔ انہوں نے ایک اور انار نچوڑا اور رس

نکالا۔ گلاس دوبارہ نہیں بھرا۔ انہوں نے دو تین اور انار نچوڑے اور رس نکالا، تب جا کر شربت کا گلاس تھوڑا بہت بھرا۔ اس نے پھر وہ بادشاہ کے آگے پیش کیا تو بادشاہ نے حیرانی سے سوال کیا کہ میاں، پہلے ایک ہی انار کافی تھا، اب اتنے سارے نچوڑے تب جا کر گلاس بھرا ہے۔ آخر کو ایسا کیوں؟“

وہ ایکسپو سینٹر کے باہر تھے۔ پارکنگ لاٹ میں کافی رش تھا۔ لوگ اندر باہر جا رہے تھے۔ ایک ہجوم ان سب سلبریٹیز اور امراء کے انتظار میں اکٹھا تھا۔ کیمروں کے فلیش، گانے موسیقی، رنگین حلے، مصنوعی مسکراہٹیں، منافقانہ رویے۔

”بزرگ نے کہا۔۔۔ ہمارے ہاں برسوں سے روایت ہے، جب رہنما کے ذہن سے کوئی برا خیال گزرتا ہے تو پھلوں کا رس خشک پڑ جاتا ہے۔“

جاوید نے ایمان کے شانے پر ایک ہاتھ مضبوطی سے رکھا۔

”آرام انسان کو کتنا بنا دیتا ہے۔ اور انسان آرام کے لیے کتنا بن جاتا ہے۔“

وہ دونوں گاڑی سے نکل گئے۔ تیار، اپنی محنت سے بنی دنیا کو آرام و آسائش میں پلے بڑھوں کے درمیان جھونکنے۔

”رہنما جب خیالِ غلط سے قدم بڑھاتا ہے تب وہ تنہا تباہ نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ اس کی قوم بھی لٹ جاتی ہے۔ بدنیتی اور بے ایمانی ہر اصول پرست کو توڑ ڈالتی ہے۔ جب اوپر سے اچھا نہیں ملتا تو نیچے بھی گند ہی پڑا ملتا ہے۔“

اپنے باپ کے سنجیدہ، اپنی آنکھوں جیسے سرمئی عکس میں دیکھتے ایمان کا جبراً مضبوطی سے بھینچ گیا۔ وہ کیمروں اور ہجوم کی رنگینی اور عیش کے قریب تھے۔

”تم نے ان جیسا نہیں بننا، ایمان۔ نہ تمہارا باپ ایک کتا ہے نہ تم اس نسل سے ہو۔ کتا ایک وفادار جانور ہوتا ہے۔ مگر جب انسان کتا بنتا ہے تو وفاداری نہیں دیکھتا۔ بس دم ہلاتا ہے اور اپنے آرام کے لیے ہر ایک کو کاٹتا ہے۔“ وہ اس کے کان کے پاس کھڑا آگے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اپنا آرام نہیں دیکھنا۔ برا بن کر اچھے کے لیے کام کرنا ایک ہنر ہے۔ کہنے سے نہیں سیکھ پاؤ گی تم مگر جس روز سیکھ جاؤ، جان لینا تمہارا باپ تم پر فخر کرتا ہے۔“

اس کے ذہن سے ایک سیاہ خیال گزرا۔ اور کیونکہ وہ اپنے باپ سے ہر طرح کا نہ سہی لیکن ہر ایک سوال کر سکتی تھی، سو اس نے وہ لازمی کیا۔

”کیا آپ مجھ پر اسی صورت فخر کریں گے اگر میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دوں؟“ ایمان نے اپنے سوال سے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

جاوید سخت نظروں کے باوجود مسکرایا۔ ایمان اسے اپنا آپ یاد دلاتی تھی، جب وہ اپنے باپ کی ہر بات کا کوئی بے باک جواب دیتا تھا۔ ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ اپنی ناراضی کا سبب گنواتے ہوئے۔

”تم میرے لیے ایک ایف ایس سی فیل، پھوہڑ اور لالچی بچی کے طور پر بھی فخر کا باعث ہوتی۔ یقیناً نہیں تو یاد کرو، سو بار کلاسز میں فیل ہوئی ہو۔ میں نے ایک بار یقین کرنا نہیں چھوڑا۔ وجہ نہ تمہارا خون ہے یا مجھ سے تعلق۔ میں تمہارا باپ نہ بھی ہوتا تب بھی مجھے تم سے یہ انسیت لازم تھا کہ ہونی تھی۔ جو سال ہمارے کھو گئے ان کا افسوس مجھے تابدار رہے گا۔ لیکن جو لمحات رہ گئے ہیں، تب میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ یاد رکھو کہ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔“

ایک لمحے کو ایمان کا دل رک گیا۔ اس کے ڈیڈ اپنے خیالات کے بارے میں کبھی اتنی لسانیت اختیار نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی وہ یہ سب بولے تھے، پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ۔ ذہن ڈگمگایا مگر ایمان کی مسکراہٹ سرشار تھی، پر مسرت تھی۔

جاوید نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو ایمان نے اسے ہلکے سے تھام لیا۔

وہ واحد مرد جس نے اس کے لیے آگ پار کی تھی۔

اگر ایک انسان تھا جو ہمیشہ اس کا ہاتھ تھامے رکھے گا، اس پر فخر کرے گا اور اس سے محبت کرے گا،

تو وہ جاوید کرمانی تھا۔

اس کا باپ۔

☆☆☆

ابرار منزل کے ماسٹر بیڈروم کے آئینے میں اپنے متمتاتے عکس کا جائزہ لینے کے بعد ایمان زرینہ کی سمت

مڑی۔

”میں بھی سوچوں میں اتنی خوبصورت کیوں ہوں۔ میری جینز کافی اچھی ہیں۔“

”بے حد۔“ زرینہ نے سنگھار میز تک جاتے ہوئے کہا۔

”ایک ولن ڈیڈ۔ ایک ولن ماموں۔ ایک ولن نانا جو مر گئے لیکن شاید زندہ ہیں۔ دو ولن مائیں۔ میں خود ایک ولن۔ اوہ، میری زندگی کتنی ایکسائٹنگ ہے!“ اس نے بھرپور مصنوعی جوش سے کہا۔ طنز ہی طنز جھلکتا تھا اس کی آنکھوں سے۔

”غالباً ہر پاگل کو خود سے باتیں کرتے رہنے کی عادت ہے۔“ زرینہ نے اپنے لیپ ٹاپ بیگ کی زپ بند کی۔ آئینے میں تکتے اپنے جوڑے سے نکلتی نادیدہ بھوری لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔ ”کسی کام آنا ہے تو جا کر میڈ سے کہو جو رشین سلاد تیار کیا ہے اسے لنچ کے لیے باہر نکالے۔ طہ اور مومن دونوں کو پسند ہے۔“

ایمان کو زرینہ نازنین سے اتنی روایتی خواتین والی گفتگو کی توقع نہ تھی۔

”آپ کی اپنی پسند کا کیا؟“ اس نے ساتھ اضافہ کیا۔ ”اور میں مری نہیں ہوں لیکن existential

crisis میں مبتلا کرنے کا شکریہ۔“

زرینہ نے کانوں سے لمبی ستارے شکل کی بالیاں اتاریں اور سنگھار میز پر ایک ڈبیہ میں دھرنے لگیں۔

”میں دال چاول پسند کرتی ہوں اور وہ رات کا مینیو ہے۔ میری فکر مت کرو، لڑکی۔ میں اس عمر سے گزر آئی ہوں جہاں عورت اپنے علاوہ ہر کسی کی پرواہ کرتی ہے۔ میں پہلے اپنی منواتی ہوں پھر دوسروں کی مانتی ہوں۔“

”کافی خود سر ہیں پھر آپ تو۔“ ایمان ہلکا سا بڑبڑائی مگر زرینہ نے سن لیا۔

”اسے تم ٹین ایجرز کی زبان میں خود سے محبت کرنا کہتے ہیں۔“ انہوں نے لفظ محبت بڑے سرد، نخوت لیے انداز میں کہا۔

”میں تیس سال کی ہوں، مس نازنین۔ اس گھر میں بھولنے کی اجازت صرف مجھے ہے، آپ کو نہیں۔“

”بھولنے سے تو تمہیں بھی بھولتا رہتا ہے کہ میں تمہاری ہم عمر نہیں لیکن دیکھو دنیا چل رہی ہے۔ کوئی کسی بھلکڑ کے لیے رک نہیں گیا۔“

ایمان کو ان کے طنز بری طرح چبھتے تھے۔

”میڈ سے یہ بھی کہنا کہ۔۔۔“

”یہ کیا میڈ میڈ لگا رکھا ہے؟ ہیڈ سٹاف کا نام رئیسہ بانو ہے۔ جس میڈ کا آپ کہہ رہی ہیں، اس کا نام نور ہے۔ ان لوگوں کا نام یاد رکھنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔“

”میں صرف اپنے مرتبے کے لوگوں کو یاد رکھتی ہوں۔ یاد کروں تو دماغ خراب ہونے، یعنی حادثے سے پہلے، تم بھی ان سے یونہی مخاطب ہوتی تھیں۔“

”مجھے بار بار اپنی غلطیاں یاد دلائے جانا پسند نہیں ہے۔ میں خود انہیں یاد کرنے کے لیے کافی ہوں۔“

”مگر کیا تمہاری یادداشت کھو نہیں گئی تھی؟ بس وہی یاد کروا رہی ہوں۔“ ایک دھیمی مسکان۔

”میں خود پر کام کر رہی ہوں اور جسے پسند نہ بھی کرتی ہوں، اسے جاننے کے لیے اس کے لیے وقت نکال رہی ہوں۔ اس احسان کا بدلہ دیں اور اپنی عمر کے بزرگوں کی طرح پیش آئیں۔ یعنی احترام دے کر احترام کی خواہش کے ساتھ۔ نارمل ہو کر۔“

ایمان نے اس دن زرینہ سے یہی تو کہا تھا۔ جب اس نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ ان کے لیے ایک کام کر سکتی ہیں۔ اس کی مینسٹور بن جائیں۔ وہ یہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور ایک سخت مزاج، بے باک اور سچی خاتون کی سرپرستی میں خود پر کام کرنا اتنا بھی برا نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن زرینہ نازنین کی زبان سے کوئی کسی کو ہلاک نہ کرے، اللہ ہر انسان کی حفاظت کریں۔ آمین!

”جو تمہارے یا دنیا کے لیے نارمل ہے وہ میرے لیے نہیں۔ میں اپنے فیصلے لیتی ہوں اور اپنی مرضی سے چلتی ہوں۔ مجھے ایک تئیس سالہ ٹین ایجر بدل نہیں سکتی۔“

ایمان نے منہ کھولا مگر اسی سے سر میں شدت سے درد دوڑا اور وہ اسے ہاتھوں میں تھامتی کچھ بھی بولنے سے رک گئی۔

زرینہ جان بوجھ کر اسے ورغلا رہی تھیں۔ وہ چند منٹ پہلے کہیں کھو گئی تھی، ایسی جگہ جہاں کسی کو نہیں جانا چاہیے۔ ملائکہ ایمان سے زیادہ بد تمیز تھی اور اسے چھپنے والے الفاظ زیادہ آسانی سے استعمال کرنے آتے تھے، وہ بس انہیں کم ہی کام میں لاتی تھی۔ ایمان اس کے مقابلے میں صرف باتیں کر سکتی تھی، اصلی طور پر تکلیف دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر وہ مضطرب تھی اور زرینہ نے اسے اپنی بیٹی مانا تھا، وہ اپنے وعدے بھولتی نہیں تھیں۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں، کسی حل کی تلاش میں، کیسے وہ ایمان کو بات کرنے پر اکسا سکتی تھیں، مگر ایسے کہ وہ کھل کر کہہ سکے، پھٹ نہ پڑے۔ جڑنے کے بجائے ٹوٹ ہی نہ جائے۔

”اس گھر کی لائٹنگ اور اسٹیمپنگ کتنا فرنگی ہے۔“ ایمان نے بلاوجہ آغاز کیا، زرینہ کو بھی بھول گیا تھا یہ لڑکی دو سیکنڈ خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ ”ایسے جیسے میں پاکستان نہیں لندن میں بیٹھی ہوں۔ کسی گاتھک فلم میں، ایک گھر میں نہیں۔ سٹوڈ آرکیٹیک۔“

نیکلی جائے بھاڑ میں۔ زرینہ نے اس پر ایک سرد و سپاٹ نگاہ ڈالی۔

”وہ آرکیٹیکٹ میں ہوں۔“

☆☆☆

دونوں باپ بیٹی ایک جیسی مصنوعی مسکراہٹوں کے ساتھ ان مصنوعی انسانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

”جاوید کرمانی، واٹ اے ہارر!“

”ایمان جاوید، واٹ این آئر!“

وہ دونوں ہنستے ہوئے بات جاری رکھتے تھے۔

سروں پر چمکتے مہنگے فانوس تھے، وسیع سکرینز پر لوگوں کے خطاب چل رہے تھے۔ سیٹیج پر نئے بڑے

بڑے لوگ آکر تقاریر کرتے، اپنی کہانی سناتے، کیسے انہوں نے سانس لے کر دنیا پر احسان کیا تھا، کیسے

ڈھیروں پیسہ، آسائش اور آرام ہونا، ان پر ایک بہت بڑا بوجھ تھا، ایسی ذمہ داری جو انہیں خوف زدہ کر دیتی تھی۔

سنہری سفید روشنیوں میں کیمروں کے فلش چل رہے تھے، مشہور لوگوں کو روک کر صحافی ان سے سوال و جواب کر رہے تھے۔ ایمان اور جاوید خود ہر ایک کو ہاتھ اٹھا کر روک دیتے تھے، وہ یہاں ٹی وی پر جھلکیاں دکھانے نہیں آئے تھے۔

جاوید عموماً ایسے ایوینو پر کبھی آتا ہی نہیں تھا، وہ فطرتاً ایک فیملی مین تھا اور اس کے لیے کام سے زیادہ اہم گھر والوں کے ساتھ بتایا گیا وقت تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کی معاشی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے دن رات کام کرتے رہنا پڑے لیکن جب وہ ضرورت مند تھا، تب بھی اس کی پہلی پرائورٹی اس کا خاندان رہا تھا۔

اس وقت وہ سب سے بڑا احسان اپنے ایک دوست سے بات کر کے کر رہا تھا۔ وہ یہاں آنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی آگیا تھا۔ وہ ایمان کو بھی ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے کئی ماہ پہلے اس سے وعدہ کیا تھا کہ

اس ایونٹ پر اسے ساتھ لائے گا اور ایمان کے کئی بار منتہی اور ملائکہ کے ساتھ مل کر ضد کرنے پر لے آیا تھا۔

ایک خاتون سے بات کرتے ہوئے ایمان کو احساس ہوا کہ وہ مدہم شائستگی سے موضوعات پر گفتگو کرتی تھیں مگر جتنا بھی غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں، وہ جاوید اور اس کی طرح اس فنڈ ریزر کے طریقہ کار سے مطمئن نہیں تھیں۔

”ایک چیریٹی ایونٹ کے لیے انتظامات دلچسپ طور پر پُر آسائش معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔“

”آپ کے وقتوں میں کیا ہوتا تھا؟“ ان کی نرم ہلکے رنگ کی آنکھوں میں دیکھتے ایمان نے استفسار کیا۔

”اس دور میں ڈائریکٹ فنڈز مانگے جاتے تھے۔ مسائل پر روشنی بکھیر کر ان کے لیے صدقات اکٹھے کیے جاتے تھے۔ لوگوں کو اینٹریٹین رکھنے کے لیے پارٹی، بوفے اور ڈانس نہیں ہوتے تھے۔ ہر کوئی اونچی

صدائوں میں اپنے پیسے اور امارت کا اعلان نہیں کرتا تھا۔ جنہیں بلایا جاتا تھا، وہ اس ذمہ داری کی نزاکت

کو سمجھتے تھے۔“ انہوں نے ویٹر کی پیش کی گئی ڈرنک کا مروت سے انکار کر دیا۔ ”یہ ایک گیٹ ٹو گیدر نہیں ہوتا تھا۔“

”یہی نہیں، اس زمانے میں ہوسٹ مس فروا سلیم ہوا کرتی تھیں اور وہ اپنے مہمانوں کو گھر کے آداب سے اچھے سے روشناس کرواتی تھیں۔“ جاوید کسی بزنس مین سے بات کر کے فارغ ہوتے ایمان کے ساتھ آکھڑا ہوا۔

فروا نے جھریوں زدہ مسکراہٹ سے اپنے دوست کے بیٹے کو نوازا۔

”وقت وقت کی بات ہوتی ہے، نہیں؟“

دو ہزار اٹھارہ، نومبر کی سات تاریخ۔

جاوید ان کے اور اپنی والدہ کے قصے سنانے لگا، کیسے وہ خواتین اس کی ناک میں دم کیا کرتی تھیں اور کتنی مشکل سے وہ لاہور آکر ان دونوں کی قید سے رہا ہوا تھا۔

ایمان کچھ دیر بعد معذرت کر کے لیڈیز روم آگئی تھی۔ اسے صبح سے بخار سا محسوس ہو رہا تھا، ابھی سر درد بڑھ گیا تھا۔ جاوید تو ہر کسی کو جانتا تھا اور ہر ایک سے بنا کر رکھتا تھا۔ ایمان کے لیے اتنے لوگوں سے بات کرنا آسان نہیں تھا۔

چہرہ میک اپ سے خالی تھا اسی لیے باآسانی دھوتے وہاں سے باہر نکل آئی۔ سر ہلکے ہلکے درد کر رہا تھا، ابھی ابھی۔ اس نے کوٹ کی جیب سے والٹ نکالا، اندر موجود ایک تصویر دیکھی۔ اس کی اپنی تصویر۔ بچپن کی۔

پھٹے کپڑے، جھلسے بازو، زخمی چہرہ۔

نظریں اٹھا کر اس ایکسپو سینٹر کے ہال میں موجود افراد کی تعداد کو اپنے اندر سمویا، انسانوں کے اتنے وجود اپنے پاس محسوس ہونے پر دل کی دھڑکن میں تیزی پائی۔

ایک لمبا، گہرا سانس لیا اور خارج کیا۔

وہ ایک آگ پار کر کے زندہ باہر نکل آئی تھی۔

وہ یہ کر سکتی تھی۔

اسے آنے والی افرا تفری کا ذرا گمان نہیں تھا۔ کسی کو نہیں ہوتا ورنہ وہ وقت سے ظالم سے جیت جاتا۔
خود کو دلاسا دیتے وہ ہلکا سا مسکرائی اور اپنے باپ کو اس ہجوم میں ڈھونڈنے آگے بڑھ گئی۔

اس کی لاعلمی میں اس کا خسارہ لکھا تھا۔

کیونکہ کہیں دور۔۔۔ کوئی تیار کھڑا تھا۔

☆☆☆

آیانیے کا بوتیک رات کے اس پہر خالی تھا۔ سنہری روشنیاں دھیمی پڑ گئی تھیں، عموماً زیادہ تر بند تھیں اور
خون بہاتی سرخ دیواروں کا رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ کئی پتلے مرے ہوئے انسانوں کی طرح کھڑے تھے، کفن
کے انتظار میں سالوں سے تڑپتے ہوئے مگر کوئی سننے والا نہیں تھا۔
کوئی رحم دل نہیں تھا۔

ایسے میں آیان کے آفس میں بتیاں بند تھیں۔ باہر سے گاڑیوں اور کھلی دکانوں کی روشنیاں اندر دمکتی
تھیں اور چند ڈبوں اور ان میں موجود موتیوں اور ڈیزائن کے آلات کو چمکا دیتی تھیں۔
اسی اندھیرے میں دروازہ وا ہونے لگا، ہینڈل ہلا، مگر پھر رک گیا۔

دروازے کے دوسری پار ہینڈل پر ہاتھ رکھے آیان کو لاریب نے روک لیا تھا۔

”چھوٹے بہن بھائی چوہوں جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں بل میں چھوڑ آؤ، خود بخود ایڈجسٹ کر جائیں گے۔ اپنا

گھر جو ہوا۔“ وہ اپنے حجاب سے باہر نکلتے بالوں کو حتی المقدور کوشش سے اندر کرتے بگڑے تنفس کے

ساتھ بولی تھی۔

آیان نے ابرو اٹھایا۔ لاریب بے چین لگتی تھی۔

”تم خود سب سے چھوٹی نہیں؟“

لاریب کا چہرہ چور سا استعجاب میں ڈھل گیا۔

”ہی ہی ہی ہی۔۔۔“ وہ بے چینی سے ہنس دی۔

”راستے سے ہٹو۔“ آیان نے اسے بازو سے پکڑ کر سامنے سے ہٹایا اور اپنے آفس کا دروازہ وا کیا۔

اندر اندھیرا تھا۔ لیکن وہ اس کی عادی ہی نہیں باسی تھی۔ دو سیکنڈ اور وہ ساتھ کھڑی ایمان کو بنا رخ

بدلے کہنی سے پکڑ کر کھینچ چکی تھی اور ساتھ روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

”ریڈ ریڈ، سالگرہ مبارک ہو!“ ایمان کی مصنوعی خوش دلانہ آواز پر آیان کے شانے ڈھلک گئے۔ کیسا آسب اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

کمرے میں سرخ و سیاہ بیلون لگے ہوئے تھے۔ اور فیری لائٹس۔ ایمان اور لاریب نے مل کر party popper پھاڑ کر ساری صفائی کا ستیاناس کر دیا۔ ہر جگہ سٹکی نوٹس بکھرے پڑے تھے جن پر یقیناً آیان کے لیے سنہری الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا۔ کمرے میں بڑے بڑے سبز رنگ کے گلنار پڑے ہوئے تھے، جیسے برسات ہوئی ہو۔ اور سب سے بدتر۔۔۔ ایک بڑا، سرخ گلابی دل کی شکل کا ویلوٹ کیک جو اس کے ڈیسک کے بچوں بیچ پڑا تھا۔ بس شکر تھا کہ آیان نے اپنی سکیچ بک سامنے نہیں چھوڑ رکھی تھی ورنہ اس نے اپنی چھریاں نکال کر ان دونوں لڑکیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے تھے۔

”زندگی کا ایک اور سال ضائع۔ جشن کا موقع ہے!“ ایمان نے اس کو پر جوش انداز میں شانے سے تھام رکھا تھا۔

”وہ بھی چودہ فروری کو۔۔۔“ لاریب نے آغاز کیا۔

”جو کہ ہوتا ہے ویلنٹائن!“ ایمان نے مکمل کیا۔

”منہ بند کرو دونوں۔“ آیان نے ناگواری سے کہا۔ جیب تک ہاتھ گیا۔

”محبت کا دن!“ ایمان کے لبوں کی اٹھان نہایت کمینی تھی۔

آیان کا ہاتھ اس کی پوشیدہ سلی جیب کے اندر گھس گیا، آج تو یہ دونوں گئیں۔۔۔

وہ خالی تھی۔

”میرے بلیڈ؟“ وہ سنگینی سے کہتے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ تیزی سے راہداری عبور کرتے وہ اس

دروازے تک گئی جو بیسمنٹ میں کھلتا تھا۔

دروازہ کھلا تھا۔

ایمان اور لاریب اس کے پیچھے تک آئیں۔ اسے وہاں پا کر باہمی غصے سے بول اٹھیں۔

”ہم نے تمہاری برتھ ڈے پر اتنی محنت کی اور تم یہاں آ گئی ہو؟“ لاریب نے کمر پر ایک ہاتھ رکھا۔

ایمان نے اس کی نقل اتاری۔ ”ہاں، بولو کیا مسئلہ ہے۔“

آیان کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ خون رگوں میں تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔ آنکھوں میں عجیب چمک۔

”ایمان، کیا تم نے میرے بلیڈ چرا کر استعمال کرنے کے بعد بیسمنٹ میں ہی چھوڑ دیے تھے؟“

ایمان کا کمر کو لگا ہاتھ دھیرے سے نیچے گر گیا۔ اس نے لاریب سے نظر ملائی۔ سر نفی میں ہلایا۔

”ہاں یا نہ، ایمان؟“ آیان نے ایک بار پھر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، ان تینوں کو بہت دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

فنڈ ریزر اپنی پوری آب و تاب سے دکتا، زور و شور سے جاری تھا۔ ایسے میں کئی منزلیں اوپر، راہداریاں

اور کئی حدود عبور کرو تو تم اس پرانے کاٹھ کباڑ اور اخباروں بھرے کمرے میں جھانک سکو گے۔

اور یہاں۔۔۔

یہاں وہ کانوں میں ایئر پیس فٹ کیے کھڑی تھی۔ سیاہ وردی، سفید بندھے بال۔ کمر پر پھینکا ہڈ، لبوں میں

بند سگریٹ۔

سرخ انگارہ آنکھیں، جیسے قتل کر کے ہی سکون میں جا سکے۔

اسی انتظار نے چین برباد کر رکھا تھا۔

اسی انتظار نے۔

دو ہزار اٹھارہ، نومبر کی سات تاریخ۔

”کیا وہ جگہ پر ہے؟“ ایئر پیس سے مردانہ آواز آئی۔ لچک دار، عمر رسیدہ، کرخت۔

کسی لومڑی جیسی۔

ایک شاطر لومڑی جس نے کئی لوگوں کو اپنے فریب کے جنگل میں پھنسا رکھا تھا۔ ایسا جنگل جہاں آگ لگا کر وہی لوگ پھنس جائیں گے اس لیے آخری چناؤ اسی کی خواہش کا تھا۔

مر جاؤ یا مارے جاؤ۔

سیاہ بادشاہ کے مخالف کوئی سفید پیادہ نہیں۔

شطرنج بھی ہو تو ایسی۔

”آل کلئیر۔“ حیا ماریہ نے رائفل کو اس کے بیگ سے نکالا۔ نزاکت سے کھڑکی میں سیٹ کیا۔ پردوں کے

پار سے وہ زمینی سطح پر بنا ہال نظر آتا تھا جہاں آج تماشہ ہونے والا تھا۔

”نشانہ لو، حیا ماریہ۔“

اس پل یہ احساس کہ وہ اپنے نام سے انصاف نہیں کر سکی، اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا۔
شدتِ ضبط سے حقارت کا احساس اپنے اندر دباتے وہ نشانہ لے کر جھک گئی۔ سیاہ وردی، سیاہ دل، سیاہ عمل۔

”دکھ رہا ہے؟“

اسے اس شخص کی ہر بات سننے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ مجبور تھی۔ اسے سفید خون والا اسی نے تو بنایا تھا۔

وہ جو تھی اس کی وجہ سے تھی۔

اس کے گناہوں کی زہریلی جڑ۔

”آ رہا ہے نظر؟“ بے صبری سے استفسار۔

حیا نے اپنی بائیں آنکھ بند کی اور دائیں سے غور کیا۔ نشانہ تاک کر لیا۔ جاوید کرمانی کا سر، اس کے ہدف پر بالکل درست نظر آ رہا تھا۔

”آل کلئیر۔“ اس نے دہرایا۔ اس سے زیادہ بولنے پر اگر کوئی اسے مجبور کرتا تو وہ ایک سے زائد افراد پر گولیاں نچھاور کر آتی۔ بھاگنا آسان تھا، اس کا مالک اس دنیا پر راج کرتا تھا۔

اس کا مالک۔۔۔

”میری گنتی پر فائز کرنا۔“

مالک۔ وہ اس کا مالک نہیں تھا۔ کوئی انسان اس کا مالک نہیں تھا۔

”ایک۔“ کوئی بھی۔

حیا کے دانت بھیج گئے۔

”دو۔“ اس کا۔

اس کا پورا وجود شدت ضبط سے کپکپایا۔

”تین۔“ مالک۔

اس نے ٹرگر پر زور سے انگلی رکھی۔

”سانس باقی نہ رہے۔“

نہیں تھا!

☆☆☆

آیان نے کسی کو دھکا دیا تھا، ایمان کہیں پر جاگری تھی اور لاریب کہیں چھپ گئی تھی۔

بیسمنٹ میں بندھے دونوں آدمی اب بندھے ہوئے نہیں تھے اور آیان کے ہتھیار ان کی صحیح جگہ پر نہیں تھے۔

آیان نے ایک مرد کے منہ پر مکا مارا اور اسے گردن سے دبوچ کر دھکیلتے ہوئے بیسمنٹ میں اپنے

ساتھ لے گئی۔ لاریب نے دوسرے مرد کے منہ پر برتھ ڈے کیک اٹھا مارا اور پارٹی پاپر لیے اس کی آنکھ کا نشانہ لے کر پھاڑ دیا۔

ایمان نے کہنی سے اس شخص کی کمر توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اپنی ہیلز اس کی رانوں میں زوردار مار دیں۔

وہ شخص اتنا بھی کمزور نہیں تھا، اس نے ایمان کی ایڑھی پکڑ کر اس کو کھینچا اور وہ فرش پر جاگری۔

لاریب بگڑے تنفس اور خراب حلیے کے ساتھ ایک بھاری موتیوں کا ڈبہ اٹھائے اس کی سمت بڑھی۔

اس شخص نے اس کی جانب لپکتے اس کا ڈبہ نیچے گرایا اور جیب سے ایک چھری برآمد کر لی۔

بیسمنٹ میں جھانکو تو آیان کو ایک سرد سفاکی سے دوسرے مرد سے لڑتے پاؤ، ہوا میں اتنی تیزی سے

مکے اور لائیں مارتے کے اندازہ کرنا مشکل تھا وہ انسان تھی یا کوئی سایہ۔ واپس اوپر پہنچو تو دیکھو کیسے

ایمان لاریب کو بچانے اس دوسرے شخص کی طرف لپکی۔

اس کے ہاتھ میں آیان کی چھری دیکھ کر ایک ابرو اٹھایا۔

”تم زندہ بچ بھی گئے تو آیان تمہیں نہیں چھوڑے گی۔“ ایمان نے اس کے مستقبل کا سوچ کر افسوس

سے کہا۔ وہ ہولے ہولے آگے بڑھ رہی تھی، لاریب اس شخص کے بازو میں دانت گاڑے خود کو

چھڑانے کی ناکام کوششوں میں تھی۔

”یہ لڑکی مر جائے گی اگر تم ہمارے ساتھ نہ چلی۔“ اس نے توڑ توڑ کر ادا کیا۔ آواز کرخت، پر عزم

تھی۔ لاریب کے منہ پر تھپڑ مار کر اس کے دانت دور کیے، اس کی گردن پر کسی بری ایکشن تھرلر کی

طرح چھری کی نوک لگائی۔

”تمہیں لگتا ہے میرے لیے خود سے زیادہ بھی کسی کی جان اہم ہو سکتی ہے؟“ ایمان نے ایسے کہا جیسے اسے اپنی بات پر یقین ہو۔

”پھر اسے مارنے پر تمہیں کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔ میں ایسا کر دیتا ہوں۔“ اس نے کمینگی سے دھمکایا۔
دھمکانے والوں کو دھمکانا اتنا آسان عمل نہیں۔

ایمان کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ اس شخص سے نظریں ہٹائے بنا دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی رہی۔ یہ وہی تھا جس کا سر اس نے بے دردی سے دس سے زائد بار دیوار میں مارا تھا، جس کے بازوؤں پر آیان نے کئی زخم دیے تھے، اسی چھری سے جس سے وہ لاریب کی گردن پر ہلکا سا کٹ لگا چکا تھا۔

”آگے مت بڑھو۔“ اس نے ایمان کو قریب آتے روک دیا۔

ایمان کا ہاتھ ایک لوہے کے پتلے تک گیا جس کی تاریں علیحدہ تھیں اور نوکیلا سٹینڈ سامنے کھڑا تھا۔
”اس کو چھوڑ دو۔“ روبروٹ سے الفاظ۔

”تم اپنا آپ ہمارے حوالے کر دو۔ تم مجاہد کی ہو۔ وہ کب سے تمہیں چاہتا ہے۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔“ وہ لاریب کو پکڑے پیچھے چلتا جا رہا تھا لیکن پیچھے بیسمنٹ کو جاتے زینے تھے اور آیان اور اس کے مخالف کی لڑائی کا شور اب تک جاری تھا۔

ایک دم آیان کی زوردار چیخ سنائی دی تو لاریب کو پکڑے آدمی مسکرایا۔ لاریب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، چہرہ سرخ سے جامنی پڑنے لگ گیا۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا اور وہ کیسے استعمال ہو رہی تھی، اپنے ہی دوستوں کے خلاف، وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

ایمان کو انہیں لمحات میں ان سرخ یادوں نے اپنے گھیرے میں لیا تھا۔

ایک سیاہ پارکنگ لاٹ۔

سرخ میں بھیگا سفید کوٹ۔

سرمنی آنکھیں۔

”تمہارا نام؟“ اس کا باپ ہمیشہ فخر سے کہتا تھا۔

”ایمان جاوید کرمانی۔“ وہ برابر فخر سے جواب دیتی تھی۔

یہ الوداع کا طریقہ تھا۔ جب بھی جاوید اسے کہیں تنہا چھوڑتا تھا تو اس سے یہی سوال کرتا تھا۔ اس کو اعتماد دلاتا تھا۔ خود پر، اپنے نام کی حقیقت پر، اپنی پہچان کی عزت پر۔

اور اس سے وہ جاوید کے منہ سے بہتا خون دیکھ سکتی تھی۔ یہ آدمی لاریب کو نہیں جاوید کو پکڑے ہوئے تھا۔ یہ لاریب کو نہیں، اس کے باپ کو اس سے ایک بار پھر چھین رہا تھا۔

ایمان کے پورے وجود پر لغزش طاری تھی۔ وہ ٹھیک سے سوچ نہیں پا رہی تھی، اس کی کنپٹی کی رگیں نمایاں تھیں اور اس کا ذہن بنجر تھا، اور وہاں ایک دم سمندر کی لہروں نے ارتعاش پیدا کیا تھا۔

اس نے گھبراتے، کپکپاتے، پتلے کے لوہے کے راڈ کو جدا کرتے ہاتھ میں تھام لیا۔

”دور ہٹ جاؤ۔“ اس نے آنکھوں میں ایک بخار زدہ تاثر کے ساتھ کہا۔

نیچے سے شور آنا بند ہو چکا تھا اور آیان اس آدمی کی سمت زینے پھلانگ رہی تھی۔ وہ اس کو پکڑنے والی

تھی، تاکہ بعد میں تفتیش کر سکے، جواب پائے، لیکن تب اسے اس لڑکی کی آواز آئی۔

”میں نے کہا۔۔۔“ ایمان کی آواز عجیب سی تھی، دیوانی سی۔ کچھ تو غلط تھا۔ کچھ تو۔۔۔“ اس سے دور ہٹ

جاؤ۔“

آیان کا وجود ایک جھٹکے سے ساکت ہو گیا۔

اس کے سامنے پشت کیے مرد کی گردن کے بیچوں بیچ سے ایک لمبا راڈ پار کرتے ہوئے اس کے چہرے سے تین انچ دور رک گیا تھا۔

وہ ایک دم پھسل کر بیسمنٹ میں ہی گرتا چلا گیا، اس کے چہرے پر خون کا فوارہ چھوڑتے ہوئے۔

زینوں کے اوپر لاریب پھٹی ہوئی آنکھوں، اپنی جگہ سے ہل چکے حجاب اور کھلے ہونٹوں کے ساتھ یہ منظر دیکھتی گئی۔ جس پل اس آدمی کے گلے کو راڈ نے چھوا تھا، اسی پل تو وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

اور اسی پل تو آیان اس کو پکڑنے وہاں پہنچی تھی۔

آیان نے خون سے بھیگے چہرے کو اٹھایا۔ بھوری آنکھیں ان پاگل سرمئی آنکھوں سے ملیں۔ اس لڑکی سے جو گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جیسے کوئی معرکہ سر کیا ہو۔

اور پھر ایمان گھٹنوں کے بل نیچے گر گئی۔

☆☆☆

جاوید کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا احساس ہوا۔

دیر سے ہوا۔

ڈسلیکسیا۔

افرا تفری کا سماں تھا اور ایمر جنسی پروٹوکول کے مطابق انہیں محفوظ راستہ فراہم کیا گیا تھا۔ اسے اس کی سالوں پہلے کی لا پرواہی کا صلہ آج ملنے والا تھا، اس نے کبھی نہ سوچا ہوگا۔

زندگی کی حقیقت غیر متوقع ہے۔

اور موت برحق ہے۔

وہ خود کو اور اپنی بیٹی کو غلط راہ پر لے آیا تھا۔ وہ ہدایات کے برخلاف "expo" کی جگہ "exit" پر آ گئے تھے۔ مرکزی ہال میں فائرنگ ہوئی تھی لیکن جن لوگوں نے اندر کو راستہ بنایا تھا وہ اسی جگہ سے اندر داخل ہوئے تھے جہاں وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اس کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

مگر اس کی کار ایک قطار میں تیسرے نمبر پر تھی۔ کونے کے پاس۔ اگر وہ اس کے اندر پہنچ جائیں تو وہ بچ سکتے تھے۔ ابھی بھی موقع تھا۔

وہ ایمان کو لے کر دوڑنے لگا۔

اس کا دشمن صرف ایک تھا۔ جسے اس کی اور عزہ کی شادی سے مسئلہ تھا۔

اس کی اور عزہ کی علیحدگی سے سکون تھا۔

جاوید اور ایمان کے مل جانے سے خار تھی۔

اس White-blooded killer کا مالک، اس کا کنٹرولر۔

کمال مجاہد۔

اس کو سینے میں زوردار جھٹکا محسوس ہوا تو وہ حواس باختہ، اپنی گاڑی سے چند فٹ دور ہی گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اس نے پھسلتے ہوئے ایمان کو اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم چپ تھی، الفاظ اس پر ختم تھے،

آج وہ ڈر گئی تھی۔ اس کے پاس صرف خوف تھا، ایک بڑی گول گیند میں بھرا خوف جو اس کے اندر

کسی پراسرار انداز میں سیاہ لہروں کی صورت گھستا جا رہا تھا، منہ کے اندر، کانوں سے، ناک سے۔

جاوید اس کو خود سے بھیچے چپ پڑ گیا۔ بولنے والا وہ منظر تھا، اس کے سفید کوٹ کو رنگتا سرخ رنگ

تھا۔ اس کے منہ میں ابلتا گرم سیال تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو ایک ہی طرح بچا سکتا تھا۔

فیصلہ اس کا تھا۔

غلطی، اب ایک فیصلہ۔

اس نے قریب سے گن لوڈ ہونے کی آواز سنی۔ تو ایک رائفل اس کو نہیں مار سکی، ثبوت اس کے سینے

میں پھنسی گولی تھی۔ اب یہ کام close range پر کیا جانا تھا۔

اس کے تاثرات خالی پڑ گئے۔ آنکھوں میں سرد پن نے جگہ لے لی۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا، اس کے اندر

صرف پچھتاوا تھا۔ منتہی کے لیے، ملائکہ کے لیے۔

اس نے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا، ایک دوسرے کا ہو بہو عکس۔

اسے افسوس تھا، ڈھیروں کرب و ملال۔ اپنی بیٹی کے لیے۔

ایمان کے لیے۔

اس لمحے جب ایمان کے ذہن میں چلتے خدشات اور اس آواز کی ہوئی پہچان کو جانچو، تو تم کیا پاؤ، وہ ماؤف ہو جاتی ہے۔ ایمان جاوید، خالی الذہنی کی کیفیت میں، منہ کھولے، ایک آدھی چیخ خارج کیے اپنے باپ کو دیکھ رہی ہے۔

اور پھر تم کیا دیکھتے ہو۔۔۔

گولی چلتی ہے۔

ایک، دو، تین۔

سانس باقی نہ رہے۔

☆☆☆

وہ وحشیانہ انداز میں چلائے جا رہی تھی۔

چہرہ بھیگا ہوا تھا، گلا رندھ گیا تھا اور حلق سے نکلتی ہوئی آواز ایسی پھٹی ہوئی تھی جیسے وہ موت کے دہانے پر ہو، اس کے اندھیرے کو اپنے گرد لپٹتا جانتے۔

وہ دیوار کے ساتھ کمر لگائے، ٹانگیں فرش پر لٹائے اور بازو نیچے گرائے ایک دم چپ کر گئی۔ کسی برف سے کٹے مجسمے کی طرح۔

اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

کپکپاتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ نظروں کے سامنے اٹھایا۔ وہ سرخ تھا، اس کے گناہوں کے داغ سے۔
بھگی نگاہیں پھسلتے ہوئے فرش پر گئیں جہاں سے لاریب اور آیان اس کو اٹھا رہی تھیں۔ خون سے لتھڑا
وجود، بے جان، مردہ۔

اس کی وجہ سے۔

”یہ میں نے نہیں۔۔۔ یہ غلطی سے۔۔۔“ ایمان نے ہلکی سسکیوں کے بیچ بولنے کی سعی کی۔

آیان نے ایک سرد نگاہ اس کے وجود پر ڈالی، پھر غیر یقینی طور پر سنجیدہ اور سکون کا مظاہرہ کرتی
لاریب کو اشارہ کیا۔ وہ اس مرد کی ٹانگیں زمین پر گرا چھوڑتے ایمان کے پاس آ بیٹھی، اس کو ہر داغ
سے بے پرواہ سینے سے لگا لیا۔

آیان نے خود ان دونوں لاشوں کو بیسمٹ میں لے جا کر ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔

خون سے لدے ہاتھوں اور سیاہ لباس والی کے بالوں کے رنگ اور چہرے پر لگے چھینٹوں کے رنگ ایک تھے۔

وہ بیسمنٹ کے اندرونی کمرے سے ایک بڑا سوٹ کیس نما ڈبہ لائی تھی اور اندر ہر طرز کا چھرا چاقو موجود تھا۔ اس نے میزوں سے کپڑوں کے ڈیزائن کے نقشے ہٹائے اور بڑی چادریں پھیلا کر ان پر دونوں وجود دھر دیے۔ ایمان اور لاریب اس کے پیچھے آ گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے یہ عمل دیکھ رہی تھیں جب آیان نے سوٹ کیس سے ایک بھاری machete نکالی اور کام پر لگ گئی۔

ہر ضرب کے ساتھ ایمان کی رنگت غیر ہوتی جاتی۔ لاریب خاموشی سے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور آیان خاموشی سے کھڑی اپنے کام میں ملوث تھی، سانس ایک دم پر سکون جیسے عام دنوں کی روٹین ہو۔ اس کے لیے ہو بھی سکتی تھی، ایمان اسے جانتی ہی کہاں تھی۔

وہ روسی لڑکی دونوں مردوں کو اچھی طرح سے کاٹ کر، ہر عضو کے ٹکڑے کرنے کے بعد انہیں

بوربوں میں بھرنے لگی۔ اس نے ہر عضو کو الگ چادروں میں لپیٹا، رسیوں سے باندھا، چپکتے ہوئے خون کو کسی لاشعوری خیال کی طرح ہاتھ سے جھٹکا۔

کئی گھنٹوں کے اس عمل کے بعد وہ فارغ ہو چکی تھی۔

ایمان کی آواز بند ہو چکی تھی۔ نظریں صاف تھیں، ان میں چلتا منظر حال کا نہیں، بلکہ کئی، کئی سال پہلے کا۔۔۔ اس کے پاس کہیں فرش پر اس کا فون گرا مسلسل بج رہا تھا۔ سکیورٹی الرٹ کی رنگ ٹون۔

لاریب بلک رہی تھی، ہلکا ہلکا لرز رہی تھی۔ اس نے آیان کے کام مکمل کرنے پر چہرہ صاف کیا اور ایمان کو سکتے میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اور آیان ہر 'پیکٹ' کو بورپوں میں بھر کر بڑے کوڑے دانوں میں بھرنے لگیں، انہوں نے اس سب کو جلا دینا تھا یا کہیں دفنا دینا تھا۔ پھر انہیں اٹھا کر وہ زینے چڑھنے لگیں۔

ایمان شل، ساکن اور بے یقین زمین پر پڑی رہی۔

فرش خونی خون تھا، اتنا سارا مدھم روشنی میں چمکتا ہوا، سیاہی مائل گہرا قرمزی سیال۔۔۔

اس میں بھی اس کو کچھ اور ہی دکھ رہا تھا۔ وہ جو اس کی آنکھوں میں بھی دکھ رہا تھا۔

وحشت کا یہ گیت۔

وہ ابھی بھی جاوید کا چہرہ دیکھ سکتی تھی اور اس کی آواز سن سکتی تھی۔ وہ زخمی تاثر دیکھ سکتی تھی، وہ بے یقین نظریں، وہ سرد پڑ جاتا وجود۔

اسے معلوم نہیں تھا وہ زیادہ کس کے لیے اشک بار ہوئی تھی۔

اپنے لیے جب اس سے اپنا پہلا اصلی گناہ سرزد ہوا تھا۔

یا اپنے باپ کے لیے، جب اس سے اپنی پہلی اصلی غلطی ہوئی تھی۔

☆☆☆

جاوید نے صحیح وقت پر ایمان کو خود سے دور دھکیلا تھا۔ وہ تین چار کے بعد گنتی بھی نہ کر سکا، اسے گولیوں میں بھون کر رکھ دیا گیا۔

ایمان ایک گاڑی کے ٹائر کے پاس گری دھول مٹی سے اٹے چہرے کے ساتھ جاوید کو اپنے گھٹنوں پر نیم کھڑا دیکھ رہی تھی۔ اپنے باپ کی موت کے کرب میں خاموش تماشائی۔

یہ اس کی زندگی نہیں تھی، یہ ایک برا خواب تھا، یہ ناممکن تھا۔ یہ وہ نہیں تھا جو ریلیٹی میں ہوتا ہے، یہ ایک بھیانک فینٹسی تھی، اصلیت نہیں۔

گولیاں بند ہو گئیں، جاوید کے پاس ایک وجود چلتا ہوا آیا، ایک نسوانی وجود۔ سفید بال، سیاہ لباس، سرخ آنکھیں۔

جاوید سے نظریں ملاتے اس نے اس کی کمر میں زوردار لات ماری اور سر پر ہڈی گراتے پارکنگ لاٹ سے غائب ہو گئی۔

ایمان نیچے گری ابھی ابھی اپنے باپ کو دیکھے جا رہی تھی، اس کی نظروں کے سامنے جیسے اس گرے ہوئے شخص کے سوا اور کوئی نہیں گزرا تھا۔ وہ زندگی کا پہلا موقع تھا جب شدتِ تکلیف سے مجبور اس کے ذہن نے اس سے باتیں چھپانا شروع کر دی تھیں۔

دور سے سائرن کی آوازیں آنے پر اس کا ہوش لوٹا اور وہ پھسلتے گرتے، بھاگم بھاگ اپنے باپ تک آئی، اس کے پاس دو زانو ہوئی، اس کا ہاتھ تھام لیا، چہرہ تھپتھپایا۔

اس کے نہ ہلنے پر ایمان کے اندر کتنا کچھ ٹوٹا تھا وہ کبھی گنتی نہیں کر پائی۔ وہ ایک گھائل ہرن جیسا دھاڑی تھی۔

اندھیری رات خاموشی سے دن کی اور چلتی گئی۔ اور تب اس کو اپنی جھوٹوں کے گرد بنی زندگی کا ایک سچ معلوم ہوا۔

قدرت سفاک نہیں ہے نہ ہے وہ رحم دل۔

قدرت بے نیاز ہے۔

☆☆☆

وہ گاڑی میں بیٹھی بالکل بے خوف تھی۔

گہرے سانس، چہرہ بار بار دھونے کے باوجود اس پر کسی اور کے خون کے گلابی داغ۔

دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے، سٹیرنگ وہیل کے گرد لپٹی انگلیاں سفید پڑ رہی تھیں، خالی ہاتھ کے ناخن ہتھیلیوں میں دھنس رہے تھے۔

شبِ سیاہ کو ایک انسان نے خود کو جانا تھا۔

اس نے گئیر کھینچتے، ایکسپریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھایا، رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ خود کشی کا ارادہ رکھتی ہو یا قتل کا، بتانا ناممکن تھا۔

دو جگہ اس نے اپنی گاڑی بمشکل راستے سے ہٹاتے کسی اور سے ٹکرانے سے بچائی تھی۔ اس کی اپنی چیخیں اس کی سماعت کو چھوڑ نہیں رہی تھیں۔

ڈیڈ۔۔۔

اس کی نظریں دھندلانے لگیں، آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور گال نمکین پانی سے بھر گئے۔ اس نے زور سے چہرے پر ہتھیلی ملتے اسے صاف کرنا چاہا مگر گلے سے ایسی سسکیاں برآمد ہونے لگیں کہ وہ خود سے خوف زدہ ہو گئی۔

جذبات۔۔۔

کیا وہ محسوس کرنا نہیں چھوڑ سکتی تھی؟

ایک دردناک یاد ذہن پر جھماکے سے لہرائی۔

اس کے جسم کے گرد حفاظت سے لپٹے بازو، ہر طرف محسوس ہوتے زوردار جھٹکے، سینے اور چہرے پر چپکتا قرمری مائع۔۔۔

سامنے ٹرک کی روشنی پر ایمان کا دل ایک لمحے کو چپ کر گیا اور اس نے آہستگی اور ڈھیروں سرعت سے سٹئیرنگ بائیں جانب گھما دیا۔

ایک جگہ آکر وہ سڑک کنارے دھک سے رک گئی۔ ذہن شل تھا، وجود کپکپاتا ہوا سرد۔
آخری لمحات ابھی دیکھنے رہتے تھے۔

☆☆☆

”تمہارا نام؟“ سرخ سیال میں ڈبڈبائی کرخت آواز۔

ایمان نے ایک جھٹکے اور ڈھیروں امید سے سر اٹھایا۔

جاوید کی سرمئی آنکھیں لیمپ پوسٹ کی روشنی میں چاندی سی لگتی تھیں، سفید کوٹ پر گرا اس کا اپنا خون چمکتا ہوا اور وہ خود سفید پڑتا، نیم مردہ، اگلے سفر کو مجبور و تیار۔

ایمان کی امیدوں بھری نگاہ پر اس نے محض سر جھٹکا۔

وہ ہچکیوں کے ساتھ اشک بہا رہی تھی۔ زوروں سے سر نفی میں ہلانے لگی۔ یہ الوداع نہیں تھا۔

یہ الوداع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”خاموش نہ رہو۔“

آخری حکم۔

آخری خواہش۔

ایمان نے اسے پورا نہیں کیا۔

وہ کر ہی نہیں سکتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ گردن اور رخسار بھیگ چکے تھے۔ اس کے ہاتھ میں

جکڑا جاوید کا ہاتھ، ایک دم گرفت ڈھیلی پڑنے پر آزاد ہو گیا۔

ان کے ہاتھ جدا ہو گئے تھے۔

اس پل، وہ کھلے آسمان کو تکتے چلائی تھی۔

وہ رو رہی تھی، جاوید کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی، اسے رکے رہنے کے لیے بھیک مانگ رہی تھی مگر وہ سن

نہیں رہا تھا اور جو نہی جاوید کی آنکھوں کی جوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گئی، وجود تھم گیا، مسکراہٹ جم

گئی۔۔۔

تب!

تب اس نے چیخنا شروع کیا تھا۔

☆☆☆

اس نے بے حس وحشیانہ انداز میں راہداری کی اس دیوار سے وہ تصویر اتار پھینکی جس پر دو لڑکیوں کے چہرے تھے، دو بھیانک حقائق تھے، دو روحوں کی تلخی تھی۔

کی پیڈ پر عجلت میں نمبر ڈائل کیے۔

صفر۔ تین۔ ایک۔ آٹھ۔ ایک۔ نو۔ نو۔

اور نو۔

دروازہ وا ہونے پر کمرے میں اسے وہی دکھا تھا جس کی موجودگی کی گھنٹیاں اس کا فون بجانے سے تھک نہیں رہا تھا۔

کمرے کے بچوں بیچ، اس مہنگے ایرانی قالین پر جوتوں سمیت وہ ریوالونگ کرسی پر گھوما تھا۔ ایک طرف کو ڈھلکی گردن، آنکھوں میں حظ سے لیس چمک۔

ایمان نے ایک اور قدم اندر کو لیا۔ گاڑی اور گھر کی چابیاں فرش پر چھناکے کے ساتھ گرا دیں، سیاہ کوٹ کو سٹینڈ کے قدموں تلے رول دیا۔ اسے یقین تھا اس کا چہرہ مومن کے ٹریڈ مارک سرد سے بھی سو گنا بدتر تھا۔

بھوری پینٹس پر ایک ہاتھ رکھے، سیاہ پورے آستین والا بازو کرسی کی پشت پر آرام دہ انداز میں پھیلائے وہ بے نیاز دکھتا تھا۔ اس نے دیواروں پر چڑھے کرائم بورڈز کی جانب سر ٹیڑھا کیا، کھلی کمپیوٹر سکرینز کی جانب دلچسپ ابرو اٹھایا۔

متاثر، پر فخر، برق زدہ سیاہ آنکھیں۔

ترش، برہم، بخار زدہ سرمئی آنکھیں۔

”مجھے مکافاتِ عمل سے ڈر لگتا تھا۔“ ایمان نے خراش زدہ آواز میں کہا، اتنی چیخوں کے بعد گلا بیٹھ سا گیا تھا۔

مومن نے سی سی ٹی وی میں چلتے ان بندھے ہوئے آدمیوں کی فوٹیج کو دیکھا۔ ایک جسے ایمان نے اکیلے پکڑا تھا اور دوسرا جسے مومن نے اکیلے پکڑا تھا۔

”تھاناکہ ہے؟“ مومن کی آواز موم تھی، بے حد نرم۔

”تھا۔“

بگڑے تنفس اور قتل کے سنجیدہ ارادے کے ساتھ، ایمان نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اس نے اپنے باپ کا سر گود میں تھام رکھا تھا۔ وہ سسک رہی تھی، مدھم، کبھی بے حد بلند۔ زور و شور سے اور کبھی سماعت میں پڑتا ہی نہ۔

اسے اپنے کندھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔

”لڑکی، ہٹ جاؤ یہاں سے۔“

مس جاوید سے بس ایک لڑکی۔ کیا یہی اوقات رہ گئی تھی اس کی؟ اسے نام دینے والے کو چپ کیے گیارہ منٹ ہی تو ہوئے تھے۔

میڈیکل کے عملے اور پولیس لیڈی سے وہ بہت جھگڑی۔ وہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی، وہ اسی پارکنگ لاٹ میں، حفاظت سے چند پل دور، اپنے باپ کی نعش کے ساتھ مٹ جانا چاہتی تھی۔

لیکن چاہنے سے اگر زندگی سب دے دیتی تو موت تم سے آخر کیونکر دور رہتی؟

اس نے گھٹنوں کے بل گرے، لڑتے اور چلاتے ہوئے سب کو خود سے دور کیا تھا۔ افراتفری میں کسی سپاہی نے اس کے منہ پر کچھ زور مارا مگر وہ خون آلود چہرے کے ساتھ ڈھٹائی سے وہیں بیٹھی رہی۔ وہ آنکھیں بند کیے چیخ رہی تھی۔ یہ اس کا نوحہ تھا، زندگی کا پہلا نوحہ۔

مگر آخری نہیں۔

اس نے اپنے باپ کی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ جب ہتھیلی دور کی تو جاوید کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

ان سرمئی نگاہوں کا اس نے مرتے دم تک آئینے میں نظارہ کرنا تھا۔

زیادہ دیر اپنے باپ کے ساتھ لگے رہنے سے ہار مانتے، کہ آخر کو اس نے بھی تو اپنی بیٹی کو ساتھ لگائے رکھنے سے ہار مان لی تھی، وہ اٹھ گئی۔

ہاتھ خالی تھے، خونی تھے۔

دل ویران تھا، اندر سرد تھا۔

اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوششیں پھر بھی کی گئیں، مگر وہ جنونی تھی، درشتی سے ایک ایک سے لڑتی گئی۔ کیمرے نے تصاویر کھینچیں، رپورٹرز نے سوال اچھالے، پولیس نے گھیرا کرنا چاہا، ڈاکٹروں نے الگ کرنا۔

وہ رکی نہیں، راستوں اور انسانوں کے بیچ سے پھسلتی گئی۔ ایک سرمئی سڑک پر اپنی سیاہ ہیلز دھرتے، اس سفید تحفے میں ملبوس، جس پر آج دینے والے کے گھاؤ کا سایہ تھا۔

سرخ، قرمزی، لال، دلچسپ۔

خون۔

ایک سوانح کا اختتام۔

دنیا میں شور تھا، ہنگامہ، مگر اس کی دنیا چپ تھی۔ بے حس۔ شل اور ساکت۔

اندھیری رات میں ایک ویران گلی میں چلتی تنہا لڑکی۔ حفاظت کا کوئی خیال نہیں، شاید ارادہ بھی نہیں۔

چند پلوں کو ہلکی بارش ہونے لگی، مگر وہ اس کے پہلے سے بھیگ چکے چہرے کو صاف نہ کر سکی۔ ایک لرزش تھی، پورے جسم پر ہولے سے طاری ہوتی گئی۔ کربناک آہوں کے ساتھ وہ ٹھوڑی کو کندھے سے بار بار ملتے چلتی گئی۔

سفید کوٹ اب خون کے داغوں کے ساتھ کیچڑ سے بھی آلودہ ہو چکا تھا۔

مر مٹ نہ جائے انسان جب اس کو سمجھنے والا ہی نہ رہے۔

مگر نہیں۔۔۔

اس کی انگلیاں اندر کو مڑ گئیں۔ ناخن ہتھیلیوں میں گڑ گئے۔ اس نے آسمان کو اپنی سرخ انگارہ نگاہوں کا

مرکز بنایا۔

خود سے اور خدا سے ایک وعدہ کیا۔

جانے والے کا نقصان وہ دنیا کو باور کرائے گی۔

کیونکہ آخر کو وہ تھی۔۔۔

”ایمان جاوید کرمانی۔“ ارادہ، اقرار، زخمی سا وعدہ۔

اور یہ تھا۔۔۔

ایک سوانح کا آغاز۔

اگلا باب، آپ کے آنسوؤں کا ثبوت ملنے کے بعد۔

جباری ہے۔۔۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔۔۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَحِبَّابُ۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا" کے ناولز میں خوش آمدید۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا" ویب سائٹ / گروپ / پیج دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں۔۔۔ ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے۔۔۔

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپ کی تحریر پوسٹ ہو جائے گی۔۔۔

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔۔

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

Novels Ki Duniya (WEB, FB Page, FB Group)

Facebook page :- [Novels ki duniya](#)

(user name [@zoyatalib77](#))

Facebook group :- [Novels ki duniya](#)

Instagram Page:- [Zoya Talib](#) (UserName:
[Novelskiduniya77](#))

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے

["novels ki duniya "](#)

اور

["website"](#)

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں ---

شکریہ ----